Regd. L. No. 7563 Phone. 80800

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

OCTOBER 1975

اکتوبر 1975

طلوعِ اسلام کنونشن

۲۳ تا ۲۶ اکتوبر

۲۵-بی، گلبرگ ۲، لاہور

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی، گلبرگ، لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک سالانہ پاکستان ـــ ۱۵ روپے غیر ممالک ـــ ۲ پونڈ	ٹیلی فون نمبر ۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ـ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ ۱½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۲۸	اکتوبر ۱۹۷۵ء	شمارہ ۱۰

فہرست

لمعات ۲

رسول اللہؐ پر جادو .... (شاہد عادل) ۹

طلوعِ اسلام کنونشن ۲۰

باب المراسلات (۱) اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی .... } ۲۱
(۲) "احمدیوں" سے متعلق قانون .... }

حقائق و عبر (۱) سوشلزم اور ارتداد ـ (۲) مودودی صاحب کا اعتراف ـ (۳) ہماری } ۲۵
صحافت ـ (۴) احمدیوں کا مسئلہ (۵) پاکستان نیشنل سنٹر (۶) نوٹیوں کا مطالبہ }

جشنِ نزولِ قرآن ۳۱

حیاتِ قائدِ اعظمؒ ۳۳

ایڈیٹر ـ محمد خلیل ـ ناشر ـ سراج الحق ـ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ـ پرنٹر ـ شیخ نیاز احمد مطبوعہ علی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

لمعات

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں ہم نے ڈھاکہ کے انقلاب پر ایک رواں سا تبصرہ کیا تھا، کیونکہ ہم تک اس کی خبر اُس وقت پہنچی تھی جب پرچہ مکمل ہو چکا تھا۔ اسی بنا پر ہم نے اپنے تبصرہ کو مجیب کی غداری تک محدود رکھا تھا، اس انقلاب کے متعلق کچھ نہیں لکھ سکے تھے، حالانکہ یہ سوال گہری توجہ کا مستحق تھا اور مستحق ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ایسے انقلابات کے وقت (جنہیں درحقیقت فسادات کہنا چاہیئے) نگاہیں عاجلہ اسباب و علل تک جا کر رہ جاتی ہیں۔ ان کے اُن محرکات تک نہیں پہنچتیں جو ان عاجلہ اسباب کا باعث بنتے ہیں۔ اس انقلاب کے متعلق بھی اسی قسم کی چند ایک باتیں ابھرنے کے بعد فضا خاموش ہو گئی کہ مجیب نے سخت غلطی کی جو بھارت کو اپنے ملک کے اندرونی معاملات میں اس قدر دخیل کار ہونے دیا۔ یا وہ روس کی طرف زیادہ مائل ہو گیا۔ یا اُس نے امریکہ سے رُخ پھیر لیا۔ یا چین کی طرف توجہ نہیں دی۔ یا ایک جماعتی نظام قائم کر لیا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ بجا اور درست، لیکن یہ صرف اسبابِ عاجلہ ہیں۔ قرآن کریم انسانی نگاہوں کو ان کے پیچھے جانے کی تلقین کرتا ہے تاکہ وہ اس قسم کے حوادث کے حقیقی اسباب کو بے نقاب دیکھ سکیں۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں کوئی واقعہ یونہی اتفاقیہ نمودار نہیں ہوتا۔ وہ نتیجہ ہوتا ہے، ان قوانینِ فطرت کی کارفرمائی کا، جن کے مطابق یہ عظیم کارگہ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ اسی طرح انسانوں کی دنیا میں بھی کوئی تبدیلی محض سطحی اسباب کی رو سے رونما نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے بھی خدا کی طرف سے اٹل قوانین مقرر ہیں۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق اپنا نظام قائم کرتی ہے، وہ زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتی ہے، وہ پہلے زوال پذیر ہوتی ہے، اور اس کے بعد تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرتی ہے۔ قرآن مجید نے وہ قوانین بیان کئے ہیں، جن سے قوموں کا عروج و زوال وابستہ ہے اور ان کی صداقت کے ثبوت کے لئے اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کو بطورِ شہادت پیش کیا ہے۔ یعنی اس نے کہا ہے کہ دیکھو! فلاں قوم نے اپنے ہاں اس قسم کا نظام قائم کیا تو اُسے زندگی کی شادابیاں اور خوشگواریاں حاصل ہو گئیں، اور فلاں قوم نے اس کی خلاف ورزی کی تو وہ تباہ و برباد

ہو گئی۔ اس کے بعد وہ قومِ مخاطب اور آنے والی اقوامِ عالم سے کہتا ہے کہ ان قوانین اور ان کی صداقت کے ثبوت میں پیش کردہ ان شواہد کی روشنی میں تم خود فیصلہ کر لو کہ تم سرفراز و شاداب رہنا چاہتے ہو یا تباہ اور برباد ہونا۔ اگر سرفراز و شادکام رہنا چاہتے ہو تو اپنا نظام قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کرو۔ اگر تباہ ہونا چاہتے ہو تو ان کے خلاف روش اختیار کر لو۔ جس قسم کی تمہاری روش ہو گی، اُسی قسم کا نتیجہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر مختلف آیات میں بیان کیا ہے۔ (مثلاً) وہ سورۃ المؤمن (نمبر ۴۰) کی آیات (۸۵ - ۸۲) میں کہتا ہے کہ کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہو گزری ہیں، اور انہوں نے اِسی قسم کی روش اختیار کر رکھی تھی جس پر یہ گامزن ہیں، تو ان کا کیا انجام ہوا۔ ان کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریاں ان کی عظمتِ گزشتہ کی درخشندہ داستانیں بھی بیان کرتی ہیں اور اس کے بعد ان کی تباہی اور بربادی کی مرثیہ خواں بھی ہیں۔ وہ قومیں تعداد میں بھی اِس قوم سے زیادہ تھیں جو (اے رسولؐ!) اب تمہاری مخاطب ہے اور قوت و حشمت میں بھی اِس سے بڑھ کر۔ اُن کی شان و شوکت کے جھنڈے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ لیکن جب ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو نہ ان کی تعداد کی کثرت ان کے کسی کام آ سکی اور نہ ہی ان کی دولت و قوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی۔ یہ تباہی ان پر اچانک نہیں آ گئی تھی۔ خدا نے اُن کی طرف اپنے پیغمبروں کو بھیجا تاکہ وہ انہیں بتا دیں کہ جس راستہ پر وہ چلے جا رہے ہیں وہ انہیں تباہی کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ لیکن وہ لوگ اپنی دولت اور قوت کے نشہ میں اس قدر بدمست اور اپنی ہنرمندیوں اور عیارانہ کارستانیوں پر اس قدر نازاں اور نازاں تھے کہ انہوں نے ان پیغامبرانِ انقلابِ آسمانی کی تنبیہات کا مذاق اڑایا اور ان سے کہا کہ ہم نے جو نظام وضع اور اختیار کر رکھا ہے اس سے ہمارے ہاں سُن برس رہا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم تباہیوں کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ آپ تشریف لے جائیے۔ ہم اپنے معاملات کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہوا وہی جو آسمانی پیغام رساں کہتے تھے۔ انہیں ان تباہیوں نے گھیر لیا جن کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے۔

یہ کچھ بیان کرنے کے بعد قرآن مجید نے کہا کہ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی جو کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص تھی۔ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ (۴۰/۸۵) "یہ خدا کی اٹل روش ہے جو تمام اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں جاری و ساری رہی ہے"۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (۳۳/۶۲) "تو خدا کی اِس روش، اس قانونِ محکم، میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا"۔ یہ اٹل اور غیر متبدل قانون ہے، جس کے مطابق قوموں کی زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان اقوام کی سرگزشتیں بڑی تفصیل سے بیان کی ہیں جن سے اس کی اولین مخاطب قوم (قومِ عرب) متعارف تھی۔ مقصد اِس سے اپنے اسی غیر متبدل قانون کی صداقت کی شہادت پیش کرنا تھا۔

پھر، قرآنِ کریم کی تعلیم اُسی قوم یا اُسی دور تک محدود نہیں تھی۔ وہ ایک ابدی صداقت تھی، جسے قیامت تک جاری اور ساری رہنا تھا۔ اس لئے جو کچھ اس نے اپنی اولین مخاطب قوم سے کہا تھا' اس کی مخاطب ہر زمانے کی ہر قوم تھی اور آج بھی دنیا کی ہر قوم ہے۔ اس ابدی صداقت کی رو سے قوموں کی زندگی میں جس قدر حوادث رونما ہوتے ہیں (اور ہو رہے ہیں) ان کی علت العلل، حقیقی اور بنیادی سبب خدا کا یہی قانون ہے۔ اُس قانون کی تفاصیل تو طویل طویل ہیں۔ لیکن اس کے ملخّص کو اُس نے اِن چار الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ هَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ (۶:۴۷) " تباہ اور برباد وہی قوم ہوتی ہے جس کے ہاں ظلم کی روش عام ہو جائے"۔ یوں تو "ظلم" کی تفصیل بھی بڑی وسیع ہے لیکن بنیادی طور پر اِس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جس شے کو جہاں ہونا چاہیئے وہ وہاں نہ ہو۔ آپ غور کیجئے کہ اس ایجاز میں کس قدر اطناب سمٹ کر آ گئے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں میں اُن گوشوں کو ابھار کر پیش کیا ہے جن میں ظلم زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اگر ان گوشوں کی ایک مختصر سی فہرست مرتب کی جائے تو اس کے عنوانات کچھ اس طرح سامنے آتے ہیں:۔

۱۔ جب کسی معاشرہ میں شرف و عزت کا معیار دولت قرار پا جائے اور محنت سے رزق کمانے والے شریف اور دیانتدار لوگوں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قومِ نوحؑ کے ساتھ ہوا۔

۲۔ جب اپنوں اور بیگانوں کا معیار، نظریاتِ زندگی کی ہم آہنگی کی بجائے رنگ، نسل یا وطن کا اشتراک قرار پا جائے تو وہ نظام بھی آخرالامر تباہ ہو جاتا ہے، کیونکہ اس معیار کی رو سے اُس پارٹی، جماعت یا قوم میں شریف اور بدمعاش، دیانتدار اور بد دیانت، مجرم اور بے گناہ، حق اندیش اور غلط کوش سب یکجا جمع ہو جاتے ہیں اور اس قوم کے افراد کی حیثیت سے ان میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی جا سکتی۔ اِس قسم کا معاشرہ بھی تباہ ہو کر رہتا ہے۔ یہ حقیقت بھی قومِ نوحؑ کے تذکرہ کے ضمن میں سامنے آتی ہے۔

۳۔ جو قوم جبر و استبداد کی بنا پر حکومت کرے اور استحصالِ عامہ ان کا شعار ہو، وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی، خواہ وہ تمدن و تہذیب کی کتنی بلندیوں تک کیوں نہ پہنچ چکی اور سائنٹفک تحقیقات میں بھی کتنی ہی آگے کیوں نہ بڑھ گئی ہو۔ قومِ عاد کی سرگزشت سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔

۴۔ جس نظام میں وسائلِ رزق پر زور آور لوگ قابض ہو جائیں اور کمزوروں اور غریبوں پر رزق کے راستے بند کر دیئے جائیں اور وہ اپنی روٹی کے لئے ان کے دست نگر اور محتاج ہو جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت اُسے تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ قومِ ثمود کی سرگزشت اُس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

۵۔ جس قوم میں تجارتی کاروبار لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ بن جائے وہ قوم بھی تباہی سے نہیں بچ سکتی۔

یہ حقیقت قومِ حضرت شعیبؑ کی سرگزشت سے ہمارے سامنے آتی ہے۔

۶- جس قوم کا نظام سیکولر ہو۔ یعنی اس میں پوجا پاٹ وغیرہ کی حد تک مذہبی آزادی ہو۔ لیکن کاروبارِ دنیا میں مستقل اقدار اور خدا کے غیر متبدل اصولوں کو دخل انداز نہ ہونے دیا جائے، وہ قوم بھی تباہی سے نہیں بچ سکتی۔ یہ حقیقت بھی قومِ شعیبؑ کی سرگزشت سے ہمارے سامنے آتی ہے۔

۷- جس قوم میں جنسی بدنہادی عام ہو جائے اور اخلاقی ضوابط اور پابندیوں سے بے اعتنائی برت کر فحاشی اور بے حیائی کا شیوہ اختیار کر لیا جائے اس قوم کی کشتی بحیرۂ مردار میں ڈوب جاتی ہے ــ قومِ لوطؑ کا انجام اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

۸- جس قوم میں قانون کی حکمرانی کے بجائے برسرِ اقتدار فرد یا گروہ کے من مانے فیصلے عوام پر مسلط کئے جائیں، اور اس طرح استبداد اور قہرمانیت، انسانیت کو ذبح کرنے لگ جائے اور مذہبی پیشوائیت کی اسے تائید حاصل ہو، اس کا حشر وہی ہوتا ہے جو قومِ فرعون کا ہوا تھا۔

۹- قرآن کریم نے قوم بنی اسرائیل کی سرگزشت زیادہ تفصیل سے بیان کی ہے۔ کیونکہ وہ ان تمام جرائم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ ان کا نظامِ زندگی ربوٰا اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر استوار تھا۔ آج کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ ان کا نظام کیپٹلزم اور تھیاکریسی کے ستونوں پر قائم تھا۔ سرمایہ داروں کو کھلی چھٹی تھی کہ وہ جس طریقہ سے چاہیں دولت سمیٹتے جائیں۔ بشرطیکہ وہ صدقہ اور خیرات کے کاموں میں چندہ دے دیا کریں اور مذہبی پیشواؤں کے اقتدار کو قائم رکھیں ــ ان کے لیڈروں کی حالت یہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ لوگ ان کی جھوٹی تعریفیں کرتے رہیں اور وہ کر کے کچھ نہ دکھائیں۔ محض بیان بازی اور خطابت کے زور پر مقبولیتِ عامہ حاصل کرتے رہیں۔ جہاں تک مذہبی پیشواؤں کا تعلق ہے، مذہب ان کا پیشہ تھا اور دین فروشی ان کا ذریعۂ معاش۔ وہ خود شریعت کے مسائل گھڑتے اور انہیں خدا کا دین کہہ کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے ــ قوم مختلف مذہبی فرقوں میں بٹی ہوئی تھی اور ان فرقوں کے پیشوا ایک دوسرے پر کفر کے فتوے عائد کر کے عوام کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے۔ حکام کے ساتھ ان کی سازباز تھی اور جس شخص کو دیکھتے کہ وہ ان کی مفاد پرستیوں کے راستہ میں حائل ہے اس کے خلاف پراپیگنڈہ کر کے اس پر زندگی حرام کر دیتے۔ یہ تھے اس قوم کے وہ نمایاں جرائم، جن کا نتیجہ ان کی ایسی تباہی تھی، جو تاریخ کے اوراق میں عبرت اور عظمت کی لرزہ انگیز داستان بن چکی تھی۔ اس قوم کی سرگزشت اور مآل سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ جس قوم کے معاشرہ میں یہ خرابیاں پیدا ہو جائیں، وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ قوموں کی تباہی کے یہی معنی نہیں کہ ان کا ہر فرد صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یا تو وہ قوم اپنا منفرد تشخص کھو کر دوسری قوموں میں جذب ہو جاتی ہے اور یا ذلت و پستی، مفلسی و ناداری، محتاجی اور محکومی کی انسانیت سوز زندگی بسر کرنے کو باقی رہ جاتی ہے۔

یہ ہیں وہ غیر متبدل قوانین، جنہیں قرآن نے قوموں کے عروج و زوال اور موت و حیات کے حقیقی اسباب کے طور پر بیان کیا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی اُس نے اِس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ قوموں کی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا کہ اُدھر اُن سے کوئی جرم سرزد ہوا اور اِدھر ان کی تباہی آ گئی۔ قوموں کی زندگی میں " خفت و ثقلِ موازین " کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ یعنی ان کے نامۂ اعمال کے طور پر ایک میزان کھڑی ہوتی ہے، جس میں ایک پلڑے میں ان کے تعمیری کارنامے ہوتے ہیں اور دوسرے میں تخریبی کارنامے۔ جب تک ان کے تعمیری کارناموں کا پلڑا جھکا رہتا ہے قوم زندہ رہتی ہے۔ لیکن جب تخریبی پلڑا جھک جاتا ہے تو وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ اس درمیانی عرصہ کو مہلت کا وقفہ کہا جاتا ہے۔ یعنی اِس قوم کے لئے اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ اگر وہ اپنے تعمیری کاموں میں، جو اقدارِ خداوندی کے مطابق سرزد ہوں، اس قدر اضافہ کر لے کہ وہ پلڑا تخریبی پلڑے پر بھاری ہو جائے، تو پھر اس قوم کی زندگی میں، یوں کہیے کہ، توسیع ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو پھر مہلت کا وقفہ ختم ہونے کے بعد وہ قوم تباہی کے جہنم میں جا گرتی ہے۔ عام نگاہیں اس انقلاب کو اس وقت دیکھتی ہیں، جب وہ محسوس شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا آغاز بہت پہلے سے ہو چکا ہوتا ہے اور وہ بتدریج آہستہ آہستہ، غیر محسوس طور پر، تپدق کی طرح اس مقام تک آ پہنچتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو قرآن یہ کہتا ہے کہ اس قسم کے حوادث کو دیکھ کر اِس کے اسبابِ عاجلہ تک نہ رُک جاؤ۔ اس کے بنیادی محرکات تک پہنچو۔ وہاں تمہیں نظر آئے گا کہ اس کا حقیقی سبب قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی تھا۔ قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی سے جو تباہی آتی ہے اُسے قرآنِ کریم کی اِصطلاح میں عذاب کہا جاتا ہے۔ معاشرہ میں یہ عذاب مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہے۔ لیکن قرآنِ مجید نے انہیں بہ حیثیتِ مجموعی تین شقوں میں تقسیم کیا ہے۔ سورۃ انعام میں ہے:-

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰٓ أَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ
أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ
بَعْضٍ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ - (۶/۶۵)

عام ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ:-

(اے رسولؐ!) تو کہہ دے کہ خدا کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ تم پر اُوپر سے عذاب بھیجے، یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے، یا تمہیں مختلف فرقوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے بھڑا دے اور باہم لڑائی کا مزا چکھا دے۔ غور کرو کہ ہم کس طرح اپنی آیات کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ سمجھ جائیں۔

مفہوم اس کا یہ ہے کہ کبھی اس عذاب کی شکل یہ ہوتی ہے کہ جابر اور قاہر، مستبد اور سرکش، اوپر کا طبقہ، عوام اور کمزور انسانوں کے سینے پر کابوس بن کر بیٹھ جاتا ہے اور ان کی ہڈیاں توڑ دیتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ نیچے کا طبقہ (عوام) اس استبداد سے تنگ آ کر ان کے خلاف بطور ردِ عمل

اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ معاشرہ میں ایسا طوفان برپا کر دیتا ہے جس میں ـــ نہ کہ ما منزلت باشد نہ پیدا ـــ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اوپر کے طبقہ کے لوگ عوام کے مختلف گروہوں کو اپنے پیچھے لگا کر انہیں مذہبی فرقوں یا سیاسی پارٹیوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور پھر یہ فرقے اور پارٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہوتے رہتے ہیں۔ اسے آپ خانہ جنگی یا سول وار کہہ لیجئے۔ یہ سب عذاب خداوندی کی مختلف شکلیں ہیں، اور اس کے قوانین سے اعراض برتنے کا فطری نتیجہ۔ مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۱ء میں جو انقلاب آیا (بالفاظ صحیح جو تلاطم برپا ہوا) اس وقت سے لے کر حالیہ حادثہ فاجعہ تک وہ بدنصیب ملک عذاب خداوندی کی انہی شکلوں میں گرفتار رہا۔ اس قسم کے عذاب کے سلسلہ میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً۔ (۸/۲۵) کہ "جب یہ طوفان برپا ہوتا ہے تو صرف انہی لوگوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا کرتا جنہوں نے ظلم و جرائم کئے ہوں۔ وہ سب کو بہا کر لے جایا کرتا ہے۔ جب دریا کے بند کو احتیاط سے نہ باندھنے کی وجہ سے سیلاب آ جاتا ہے تو وہ صرف انہی کے گھروں کو تباہ نہیں کرتا جو اس بے احتیاطی یا بددیانتی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ بستیوں کی بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ معاشرہ کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج ہر ایک کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے موعظت آموز اور بصیرت افروز محاکاتی انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے کہ جہنم میں لیڈر اور عوام ایک دوسرے سے جھگڑیں گے اور انہیں مطعون کریں گے کہ وہ عذاب ان کی وجہ سے آیا ہے۔ عوام خدا سے فریاد کریں گے کہ وہ ان لیڈروں کو دوہرا عذاب دے، جن کی بدکرداریوں کی وجہ سے انہیں بھی جہنم کا عذاب بھگتنا پڑ رہا ہے۔ جواب ملے گا کہ تم دونوں دوہرے عذاب کے مستحق ہو۔ لیڈر اس لئے کہ انہوں نے نہیں استعمال کیا، اور عوام اس لئے کہ وہ خاموشی سے ان کا آلۂ کار بنتے رہے۔ بہرحال، صورت کچھ بھی ہو، تباہی کا عذاب سب کے لئے ہوتا ہے۔ اس سے سارا ملک برباد ہو جاتا ہے؛ پوری کی پوری قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ ہوتا ہے غلط نظام معاشرہ کا نتیجہ ـــ مشرقی پاکستان (یا اب بنگلہ دیش) میں یہی ہوا۔ وہاں طبقۂ بالا کے ساتھ تو جو ہونا تھا ہوا۔ لیکن ان کے ساتھ وہاں کے عوام پر جو کچھ گذری اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس کی جو تھوڑی بہت تفاصیل اس زمانے میں یہاں پہنچی تھیں، انہیں پڑھنے یا سننے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ۱۹۷۱ء کے حادثہ سے پہلے اس کی نوعیت مختلف تھی۔ اس کے بعد اس کی شکل تو بدل گئی، لیکن ملک عذاب خداوندی میں بدستور گرفتار رہا۔ جرائم بڑھتے گئے۔ ظلم زیادہ ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ تخریبی پلڑا اتنا جھک گیا کہ اس سے وہاں کے نظم و نسق کا تختہ الٹ گیا۔ معلوم نہیں اب بھی وہاں کے عوام پر کیا گذر رہی ہے۔

ہم نے دیکھا کہ وہاں کے حالیہ انقلاب پر مغربی پاکستان میں بالعموم مسرتوں کے شادیانے بجائے گئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم نے بھی مجیب کے انجام کا کچھ اسی طرح سے استقبال کیا۔ لیکن ایسے تغیرات یا مجرموں کے اس قسم کے مآل اور انجام پر ہماری طرف سے اطمینان بخش یا بعض اوقات

مسرت خیز اظہار اس لئے ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک یہ چیزیں قانونِ خداوندی کی صداقت کی شہادت بنتی ہیں۔ یہی وہ جذبۂ اطمینان و تشکر ہے جس کا قرآنِ کریم نے مجرمین کے ایسے انجام کے موقعہ پر ان الفاظ میں اظہار کیا ہے۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ (۶/۴۵)

"وہ لوگ جنہوں نے اس قدر اندھیر مچا رکھا تھا، ان کی جڑ کاٹ گئی"۔

اور اس کے بعد وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۶/۴۵) ایسے حوادث حمدِ رب العالمین کا مقام اس لئے بنتے ہیں کہ ایک تو ان سے قوانینِ الٰہیہ کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچتا ہے اور دوسرے ہر ظالم کی تباہی مظلوم کے لئے سکھ کا سانس لینے کا موجب ہوتی ہے۔

لیکن ہم میں سے جن لوگوں نے اس انقلاب پر یہ کہہ کر چراغاں کیا کہ یہ بہت اچھا ہوا — ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ انہیں ہم شیخ سعدیؒ کا وہ مشہور پند آموز شعر سنا دینا ضروری سمجھتے ہیں جس میں انہوں نے کہا ہے ؎

اے دوست! بر جنازۂ دشمن چو بگذری
شادی مکن کہ باتو ہمیں ماجرا رود

دشمن کی موت پر شادیانے مت بجاؤ کہ کل کو خود تمہارا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔ آپ اپنے معاشرہ پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ قوموں کو تباہ کرنے والے جرائم کی جو فہرست قرآنِ کریم نے پیش کی ہے، ان میں کوئی ایک جرم بھی ایسا ہے جو ہمارے معاشرہ میں عام نہ ہو چکا ہو، اور پھر اس پر غور کیجئے کہ ان جرائم کی وجہ سے اگر بنگلہ دیش میں ایسی تباہی آ سکتی ہے تو ہم اس سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ بات تو ساری دیر سویر کی ہے۔ ان کی مہلت کا عرصہ ختم ہو گیا اس لئے عذاب اپنی محسوس شکل میں جلدی سامنے آ گیا۔ ہماری مہلت کے وقفہ میں کچھ دیر باقی نظر آتی ہے، اس لئے، اگر حالات یہی رہے اور ہم نے اپنی تخریب کو تعمیر میں نہ بدلا تو، ہمارا انجام بھی یہی ہوگا۔ دنیا کی کوئی قوت ہمیں اس سے نہیں بچا سکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اکثر بہی خواہانِ ملت قوم کو اس آئندہ تباہی سے بچانے کی مختلف تدبیریں سوچ رہے ہیں، لیکن معاف فرمائیے کہ اگر ہم یہ کہنے کی جرأت کریں کہ ان کی نگاہیں علاماتِ مرض پر ہیں، علتِ مرض پر نہیں۔ یہ صرف عاجلہ اسباب کو دیکھتے ہیں، ان کے پسِ پردہ حقیقی محرکات کو نہیں۔ علتِ مرض یہی ہے کہ یہاں اخلاقی اقدار کو بری طرح سے پامال کیا جا رہا ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل پر کسی کا ایمان نہیں رہا۔ ہر قسم کے جھوٹ اور دغابازی۔ دجل اور فریب میں کامیابیوں کا راز سمجھ لیا گیا ہے۔ خلافِ قانون و قاعدہ جبر و استبداد کو نظم و ضبط کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ قانون شکنی اور حدود فراموشی کو آزادی سمجھ لیا گیا ہے۔ معیارِ تکریم و تعظیم دولت اور صرف دولت قرار پا چکی ہے۔ جب کسی معاشرہ کی کیفیت یہ ہو جائے تو پھر خدا کے غیر متبدل قانون کی رو سے اسے تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ بات صرف دیر سویر کی رہ جاتی ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر

جادو کی روایت

شاھد عادل (میانوالی)

انبیاءؑ سابقہ کی تعلیمات پر پردہ پوشی کی وجہ سے انسانیت، تباہی کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپؐ نے قومِ عرب کو جو آپ کی اوّلین مخاطب تھی، اور جس کی حالت دوسری اقوام کی نسبت زیادہ ابتر تھی، کمالِ انسانی پر پہنچا دیا ـــــ پھر ان اونٹ چرانے والے عربوں نے دنیا سے ظلم و ناانصافی کے خاتمے کے لئے اس وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ایوانوں پر اسلام کا جھنڈا لہرا دیا۔ ان ممالک کے غریب عوام نے جو حکمرانوں کے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے، جہاں مسلمانوں کا خیرمقدم کیا، وہیں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو اقتدار سے محرومی کی وجہ سے مسلمانوں کا جانی دشمن بن گیا۔ اور چونکہ ان کے پاس کسی قسم کی طاقت باقی نہیں رہی تھی، اس لئے انہوں نے مختلف سازشوں کے ذریعے مسلمانوں سے بدلہ لینے کی کوشش کی۔ انہی سازشوں کا ایک مذموم حصّہ رسول اللہؐ کی سیرتِ طیبہ پر مختلف قسم کے اعتراضات کی صورت میں تھا۔

ان اعتراضات میں سے ایک اعتراض رسول اللہؐ پر جادو ہونے کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جادو ایک لغو چیز ہے، جسے مسلمان مبنی برحقیقت سمجھتے ہیں۔ اس کا اثر اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ نفسیاتی قسم کا ہوتا ہے۔ جس کا ظہور صرف انہی اشخاص پر ہو سکتا ہے۔ جن کی قوتِ ارادی (WILL POWER) کمزور ہو۔ اس کے برعکس جو شخص مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہے، اس پر یہ کسی طور پر اثرانداز نہیں ہو سکتا۔ پھر اس صغریٰ کبریٰ سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ نعوذ باللہ رسول اللہؐ کمزور قوتِ ارادی والے شخص تھے۔

دشمنانِ اسلام نے یہ اعتراض اپنے جی سے نہیں گھڑ لیا۔ بلکہ اس کی بنیاد وہ ان روایات پر اٹھاتے ہیں جو حدیث کی معتبرترین کتاب یعنی صحیح بخاری میں ملتی ہیں۔ تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ ان روایات کا مضمون ملتا جلتا ہے۔ اس لئے طوالت سے بچنے کے لئے ہم ان میں سے صرف ایک نقل کرتے ہیں۔ اور وہ بھی تو جمہ جو صحیح بخاری کا مستند ترجمہ سمجھا جاتا ہے۔ اور جو محمد سعید اینڈ سنز کراچی کی جانب

سے شائع کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

(ترجمہ) عبداللہ بن محمد ابن عیینہ سے بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث کو سب سے پہلے مجھ سے ابن جریج نے بیان کیا۔ وہ کہتے تھے کہ مجھ سے آل عروہ نے بواسطہ عروہ بیان کیا۔ تو میں نے ہشام سماس کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے مجھ سے اپنے والد کے واسطہ سے، انہوں نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا گیا تھا۔ جس کے اثر سے آپ کا یہ حال تھا کہ اپنی بیویوں کے پاس جاتے بھی نہ تھے لیکن یہ خیال ہوتا تھا کہ ان کے پاس سے ہو آیا ہوں۔ سفیان نے کہا کہ جب یہ صورت حال ہو تو یہ جادو کا سخت اثر ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ عائشہؓ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دے دی جو میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس دو آدمی آئے۔ ان میں سے ایک میرے سر کے پاس بیٹھ گیا اور دوسرا میرے پاؤں کے پاس بیٹھا۔ جو سر کے پاس بیٹھا تھا، اس نے دوسرے سے کہا کہ اس آدمی کو کیا ہو گیا ہے۔ دوسرے نے کہا اس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ پہلے نے پوچھا، کس نے جادو کیا ہے؟ دوسرے نے کہا۔ لبید بن اعصم نے جو بنی زریق میں کا ایک آدمی ہے۔ یہود کا حلیف اور منافق تھا۔ پہلے نے پوچھا کس چیز پر (جادو کیا گیا ہے) دوسرے نے جواب دیا کہ کنگھی اور ان بالوں پر جو جھڑتے ہیں۔ پہلے نے پوچھا۔ وہ کہاں ہیں؟ دوسرے نے جواب دیا کہ ذروان کے کنویں میں، کھجور کی جھلی میں پتھر کے نیچے ہیں۔ آپ اس کنویں کے پاس تشریف لائے تاکہ اس کنگھی وغیرہ کو نکالیں۔ آپ نے فرمایا یہی کنواں ہے، جو مجھے دکھلایا گیا ہے۔ اس کا پانی مہندی کے نچوڑ کی طرح بالکل سرخ ہے۔ اور کھجور کا درخت شیطان کے سروں کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ آپ نے وہ چیزیں نکلوا لیں اور دفن کرا دیں۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا کہ آپ نے اعلان کیوں نہیں کر دیا، تو آپ نے فرمایا کہ بخدا مجھے شفا ہو گئی، اور مجھے ناپسند ہے کہ میں کسی برائی کو مشہور کروں۔ (صحیح بخاری مترجم اردو جلد سوم صفحہ ۲۹۵ پارہ ۲۴ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

ہمارے لئے تمام معاملات میں معیار حق قرآن حکیم ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اسے ہم نے غلافوں میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔ آیئے تھوڑے سے وقت کے لئے اسے نکالیں کہ وہ اس اہم واقعہ کے بارے میں کیا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ اعجاز قرآنی ملاحظہ ہو کہ جس واقعہ سے ہماری کتب روایات کے صفحے بھرے ہوئے ہیں۔ قرآن کریم ایک مختصر سی آیت میں اس کا فیصلہ سنا دیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا (سورۃ بنی اسرائیل - ۴۷)

(ترجمہ) ظالم لوگ یعنی کفار کہتے ہیں کہ تم ایک سحر زدہ آدمی کی پیروی کرتے ہو۔

دوسرے الفاظ میں رسول اللہ کو سحر زدہ قرار دینے والوں کو قرآن مجید کافر اور ظالم کہہ کر پکارتا ہے۔ لیکن چونکہ قرآن حکیم ہم محض تبرک کے لئے تلاوت کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس لئے عملی مسائل میں ہمارے ہاں بخاری شریف کی حیثیت قرآن کریم سے بڑھ کر تصور کی جاتی ہے اور اس کی زندہ مثال یہی حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر جادو والی روایات ہیں کہ قرآن کریم کی تردید کے باوجود اسے ہمارے ہاں ایک مسلمہ

کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ بلکہ اگر کوئی صاحب قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت کا حوالہ دے کر ان کی روایات کی کمزوری کی طرف اشارہ کرتا ہے، تو اس پر جھٹ سے منکرِ حدیث کا فتویٰ جڑ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ مذکورہ بالا آیت مبارکہ کسی نے آج قرآنِ حکیم میں داخل نہیں کی، بلکہ وہ تو بخاری شریف کی تدوین سے بھی صدیوں پہلے اس میں موجود تھی۔ لیکن اس کے باوجود قرآنِ کریم کے ارشاد کے مقابلے میں، بخاری شریف کی روایت کو زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ دیکھئے کس طرح روایات کے مقابلے میں قرآنِ کریم کی آواز دب جاتی ہے؟

یہ واقعہ برسوں میرے ذہن میں کھٹکتا رہا، اور اس موضوع پر ہر طبقۂ خیال کے علماء سے گفتگو ہوتی رہی۔ قرآن سے استدلال کا جواب دینے کی بجائے ان حضرات نے ہمیشہ یہ سوال اٹھایا کہ آخر بخاری شریف کی یہ روایات سلف صالحین کے سامنے بھی تھیں۔ انہوں نے اسے خلافِ قرآن کیوں نہ قرار دیا۔ میرے لئے یہ جواب غیر متوقع نہیں تھا۔ کیونکہ جب کسی قوم پر جمود چھا جاتے تو اس کے علماء اپنی جان چھڑانے کے لئے اسی قسم کی تاویلات سے کام لیتے ہیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ اتنی بڑی حقیقت ہمارے سلف صالحین کی نظروں سے اوجھل ہو۔ لیکن چونکہ ہمارے ہاں دینی علوم کا معیار نہایت پست ہے، اور ہمارے علماء صرف اسی محدود علم پر اکتفا کرتے ہیں جو وہ اپنے اساتذہ سے حاصل کرتے ہیں اور اگر اس محدود علم میں کوئی غلطی رواج پا گئی تو وہ بھی نسلاً بعد نسلٍ پختہ تر ہوتی جائے گی۔ کیونکہ تقلیدِ جامد کے غلبہ کی وجہ سے کسی مسئلہ کو قرآنی تعلیم کے مطابق پرکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر قرآن کے مقابلے میں حدیث اور فقہ کو سند تسلیم کیا جاتا ہے۔

میں اس کاوش میں رہا کہ ہمارے مسلک میں جس فقہ کی تقلید کی جاتی ہے۔ اس سے تعلق رکھنے والے سلف صالحین کی اگر تحقیق مل جائے تو وہ ہمارے علماء کے لئے سب سے زیادہ مقبول سند ہو سکتی ہے۔ الحمدللہ کہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور مطلوبہ حوالہ جات مل گئے۔ خیال رہے کہ رسول اللہ پر جادو کے اثرات والی روایات کی بنیاد اس پر ہے کہ ہمارے بعض علماء اس لغو چیز کو برحق سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ جادو اپنی حقیقت رکھتا ہے۔ پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کیا سلف صالحین بھی واقعی اسے ایسا سمجھتے تھے۔ چونکہ اس بارے میں ہم حنفی فقہ کے ائمہ تک محدود رہنا چاہتے ہیں، اس لئے حنفی فقہ کے بانی حضرت امام ابوحنیفہؒ کے فیصلہ کو نقل کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

علامہ شوکانی فرماتے ہیں:۔

من ذهبت المعتزلة و ابوحنيفة الى انه خدع لا اصل له ولا حقيقة۔

(ترجمہ) معتزلہ اور امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ جادو ایک دھوکا ہے۔ جس کی کوئی اصل نہیں، اور نہ ہی اس کی کوئی حقیقت ہے۔ (تفسیر فتح القدیر۔ جلد اول صفحہ 119)

جب جادو دھوکے کے سوا کوئی چیز ہی نہیں تو رسول اللہ پر جادو کے اثرات والی روایات کی ساری عمارت

دھڑام سے گر پڑتی ہے۔ تاہم حنفی ائمہ نے اس سارے واقعے پر پوری تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور اسے قرآن مجید کے خلاف ثابت کیا ہے۔ حنفی فقہ کے مشہور امام قاضی ابوبکر جصاص جنہوں نے حنفی فقہ کے اصولوں کے مطابق قرآن حکیم کی تین جلدوں میں مکمل تفسیر احکام القرآن لکھی ہے۔ نے اس بحث کو نقل کیا ہے اور بخاری شریف کی مذکورہ بالا روایات کو جو ہمارے اس مسلہ کی حقیقت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ انہیں ملحدوں کی وضع کردہ بتاتے ہیں۔ انہی کی زبانی سنیئے:۔

ومثل هذا الاخبار من وضع الملحدين (احکام القرآن جلد اول صفحہ ۵۵)

(کہ رسول اللہ ؐ پر جادو کی روایات ملحدین کی وضع کردہ ہیں)۔

خیال رہے کہ سلف صالحین کسی روایت کو ضعیف یا جھوٹا قرار دیتے وقت ایسے سخت الفاظ بہت کم استعمال کرتے تھے۔ جیسا کہ قاضی ابوبکر جصاص نے جادو والی روایات کے بارے میں استعمال کئے ہیں — بلکہ ایسے مواقع پر عام طور پر تاویل سے کام لیا جاتا ہے کہ راوی سے بھول چوک یا نسیان ہوگیا ہوگا یا زیادہ سے زیادہ اس کی کسی کمزوری کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی ضعیف روایت کے راویوں کو بھی ملحد قرار دیا گیا۔ جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔

چنانچہ اس جادو کے سلسلہ میں مزید بحث کرتے ہوئے کہ ہماری کتب تفاسیر میں جادو وغیرہ کے جو قصے نقل کئے گئے ہیں اور بعض مفسرین انہیں صحیح سمجھتے ہیں، ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

فيصدقونه ومن صدق هذا فليس يعرف النبوة ولا يامن ان تكون معجزات الانبياء من هذا النوع وانهم كانوا سحرة وقال الله تعالىٰ وَلَا يفلح الساحر حيث اتى۔ (ایضاً)

(ترجمہ) کہ یہ لوگ ان (جادو کے قصوں) کو سچا مانتے ہیں۔ اور جس نے انہیں سچا مانا وہ نبوت کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ بلکہ خدشہ یہ ہے کہ وہ انبیاء کے معجزات کو بھی جادو جیسی کوئی چیز سمجھ لیں اور نعوذ باللہ انبیاء کو جادوگر۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جادوگر جہاں بھی ہو فلاح نہیں پا سکتا۔

اس کے بعد رسول اللہ ؐ کے مسحور ہونے کے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان حضرات کے متعلق لکھتے ہیں۔

وقد اجازوا من فعل الساحر ما هو اعظم من هذا واقطع وذلك انهم زعموا ان النبي عليه السلام سحر وان السحر عمل فيه حتى قال فيه انه يتخيل لي اني اقول الشيء وافعله ولم افله ولم افعله (ایضاً)

(ترجمہ) انہوں نے تو جادوگروں کے ایسے کاموں کو بھی صحیح سمجھ لیا ہے جو اس سے بھی زیادہ گھناؤنے اور غلیظ ہیں اور وہ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا اور یہ کہ جادو نے آپ پر اثر بھی کیا تھا۔ یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے فلاں بات کہی یا کی ہے۔ حالانکہ نہ اسے کہا ہوتا ہے اور نہ کیا ہوتا ہے۔

پھر ان حضرات کے اس طرزِ عمل پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

والعجب ممن یجمع بین تصدیق الانبیاء علیہم السلام و اثبات معجزاتھم وبین التصدیق بمثل ھذا من فعل السحرۃ۔ (ایضاً ص۵۶)

(ترجمہ) اور ان لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جو انبیاء علیہ السلام کی نبوت اور معجزوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جادوگروں کے اس قسم کے شعبدوں کی بھی تصدیق کرتے ہیں۔

پھر قرآن مجید کی اسی آیت سے کہ جس کا حوالہ ہم شروع میں دے چکے ہیں، استدلال کرتے ہوئے اس واقعہ کو جھوٹا قرار دیتے ہیں۔

وقد قال اللہ تعالیٰ مکذبا للکفار فیما دعوۃ من ذالک للنبی صلے اللہ علیہ وسلم فقال جل من قائل وقال الظالمون ان تتبعون الا رجلا مسحورا (ایضاً ص۵۵)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس دعوے کو جھٹلاتے ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا۔ ان کا یہ قول نقل کیا کہ ظالم (کفار) کہتے ہیں کہ تم ایسے شخص کی پیروی کرتے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے۔

اور پھر جس طرح انہوں نے ان روایات کو ملحدوں کی وضع کردہ بتایا ہے۔ اس کی تفصیلات مضمون کے ابتداء میں گزر چکی ہیں۔

یہ تو تھی ہمارے قدامت پسند علماء کے ایک غلط مسلک کی تردید، خود ایسے ائمہ کی زبانی جن کی تقلید کا وہ دم بھرتے ہیں۔ میرے ذہن میں ایک خوش فہمی تھی کہ ان قدامت پسند علماء کے مقابلے میں ایک ایسی تفسیر لکھی جا رہی ہے جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ وہ زمانۂ جدید کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور جس نے اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر ہزارہا جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو الحاد اور بے دینی کے آغوش میں چلے جا رہے تھے، دین کی طرف راغب کیا۔ یہ تفسیر تفہیم القرآن تھی جس کے مصنف سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہیں۔ جن کی قرآنی فکر کے بارے میں ان کے پیروکاروں کی جانب سے بلند بانگ دعوے کئے جاتے ہیں۔ میری خوش فہمی یہ تھی کہ انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر دشمنوں کے اس لگائے ہوئے داغ کو ضرور دھو دیا ہوگا۔ چنانچہ اسی خوش فہمی کے تحت میں نے ان کی تفسیر کا مطالعہ شروع کیا۔ لیکن جب متعلقہ مقام پر پہنچا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا، اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے اپنی تفسیر کی جلد ششم کی آخری دو سورتوں کی تفسیر امام بخاریؒ کی مختلف روایات کی بنا پر کی ہے۔ بلکہ ان مختلف روایات کے مضمون کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کر کے قرآنِ حکیم کی تفسیر کا حق ادا کر دیا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم ۷ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد آیا۔ اور ایک مشہور جادوگر لبید بن اعصم سے ملا۔ جو انصار کے قبیلہ بنی زریق سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے کہا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے ساتھ جو کچھ

کیا ہے وہ تو تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں انہیں قبول کرو اور محمد (صلعم) پر ایک زور کا جادو کرو۔ اس زمانے میں ایک یہودی لڑکا حضورؐ کے ہاں خدمتگار تھا۔ اس سے سازباز کر کے ان لوگوں نے حضورؐ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کیا جس میں آپ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دانوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ لبید بن اعصم نے خود جادو کیا تھا اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگرنیاں تھیں، اُن سے اس نے جادو کرایا تھا۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو۔ اس جادو کو ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھ کر لبید نے بنی زریق کے کنویں ذروان یا ذی اروان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس جادو کا اثر نبی صلعم پر ہوتے ہوتے پورا ایک سال لگا، دوسری ششماہی میں کچھ تغیر محسوس ہونا شروع ہوا۔ آخری چالیس دن سخت اور آخری تین زیادہ سخت گزرے۔ مگر اس کا زیادہ سے زیادہ جو اثر حضور صلعم پر ہوا وہ بس یہ تھا کہ آپ گھلتے جاتے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا ـــــــ اپنی ازواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے۔ اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا۔"

(تفہیم القرآن جلد ششم صفحہ ۵۵۴)

مودودی صاحب کی یہ تفسیر بخاری شریف کی روایات سے بھی زیادہ واضح ہے، اور ان کی یہ وضاحت کہ آپ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا سے تو خود مقامِ نبوت متاثر ہوتا ہے، اور پھر ایک یہودی لڑکے کو آپ کا خدمت گار دکھایا گیا ہے۔ کیا اس آخری دور میں بھی آپ کو اپنے جان نثار صحابہؓ میں سے کوئی خدمت گار میسر نہ تھا...!

خیال رہے کہ مودودی صاحب بخاری شریف کی روایات کو من وعن تسلیم نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں یہ عقیدہ صرف اہلِ حدیث حضرات کا ہے کہ بخاری شریف کی ہر روایت نہ صرف یہ کہ صحیح ہے بلکہ ان میں سے کسی کا انکار بھی ایک مسلمان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ لیکن مودودی صاحب کی یہ مجبوری نہیں۔ وہ بخاری شریف کی تمام احادیث کو صحیح نہیں سمجھتے اور اس بارے میں ان کی تحقیق یہ ہے:۔

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔　　　(ترجمان القرآن، بابت اکتوبر، نومبر سنہ ۱۹۵۲ء)

پھر احادیث کو پرکھنے کا ان کا اپنا ایک معیار ہے جو خود ان کے اپنے الفاظ میں کچھ یوں ہے:۔

"جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول میرے سرکارؐ کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنتِ نبویؐ کے

اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی، ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح، روحِ محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اس طرح دیکھتا، اور سوچتا ہے۔ جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا جائے اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا دارومدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے، اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے جام لذیں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔

(تفہیمات۔ جلد اوّل از مودودی صاحب۔ صفحہ ۲۹۶)

مودودی صاحب کے اس اصول کو سامنے رکھئے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بخاری شریف کی جادو والی روایت کو آپ نے اس لئے صحیح نہیں سمجھا کہ وہ بخاری شریف میں درج ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ان کی بصیرت نے ان کی رہنمائی کی کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ یعنی جادو بھی برحق ہے اور یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اس نے اثر بھی کیا تھا، جو کئی دن تک باقی رہا۔ جیسا کہ ہم سطورِ سابقہ میں نقل کر آئے ہیں، قرآن مجید اس بہتان کو ظالموں یعنی کفار کی طرف منسوب کر کے اس کی تردید کر رہا ہے۔ لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ مودودی صاحب کی بصیرتِ قرآنی، ظالمین اور کفار کے اس افترا کو برحق قرار دے رہی ہے (نعوذ باللہ) ان کی یہ بصیرت تو خود، اللہ تعالےٰ کے خلاف نظر آتی ہے۔!

جیسا کہ سطورِ بالا میں گذر چکا ہے۔ حنفی فقہ کے ائمہ نے اس روایت کو ملحدین کی وضع کردہ قرار دیا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس سے رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کو داغدار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مودودی صاحب کی بصیرتِ قرآنی اس واقعہ کو سچا قرار دے رہی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے انہیں اس امر کا ذرہ بھر خیال تک نہ آیا کہ ان کی بصیرتِ قرآنی کس طرح دشمنانِ اسلام کے ہاتھ مضبوط کرے گی۔ پھر سوچئے کہ جب اس تفسیر کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہوگا، جو یورپ و امریکہ میں پہنچے گا تو وہ مخالفینِ اسلام جو اس روایت کی بنا پر رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کو داغدار بنانے پر تلے ہوئے ہیں کس قدر خوشیاں منائیں گے۔

اس موقع پر مجھے طلوعِ اسلام کی وہ اپیل یاد آگئی، جس کا عنوان تھا۔ "مودودی صاحب خدا کے لئے رک جائیے۔ (طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۳ء) غالباً اس اپیل کرنے والے کے سامنے بھی مودودی صاحب اسی قسم کی تحقیقات اور بصیرتِ قرآنی کے نمونے تھے جن سے نہ صرف یہ کہ رسولِ اکرمؐ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ داغدار ہوتی ہے۔ بلکہ دشمنانِ اسلام کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔

مودودی صاحب کے پاس جادو کے برحق ہونے کی دلیل

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جادو جسے حنفی فقہ کے بانی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دھوکا اور لغو قرار دیتے ہیں..... مودودی صاحب جو اسے برحق تسلیم کرتے ہیں، ان کے پاس اس کی کونسی دلیل ہے۔ یہودیوں کے ہاں یہ قصے مشہور ہیں کہ جادو کی بنیاد حضرتِ سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں پڑی، جبکہ آسمان سے دو فرشتے ہاروت ماروت اتر کر لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ یہ فرشتے اب بھی بابل کے ایک کنوئیں میں اوندھے لٹکے ہوئے ہیں، اور لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے ان بے سروپا قصوں کی تردید کی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ط وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ..... (۲/۱۰۲)

(ترجمہ) اور نہیں اتارا گیا بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پہ اور نہ وہ دونوں کسی کو یہ کہتے ہوئے کہ ہم آزمائش ہیں، کچھ (جادو) سکھاتے تھے۔

خود صحابہؓ کرام اور ہمارے بڑے بڑے مفسرین نے اس کی یہی تفسیر بیان کی ہے۔ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ، اور امام فخرالدین رازی نے جادو والے اس ہاروت ماروت کے سارے قصے کو لچر، فاسد اور مردود قرار دیا ہے۔ امام الشہاب العراقی کا کہنا تو یہ ہے کہ جس کا اعتقاد یہ ہو کہ یہ دو فرشتے ہیں جو زہرہ سے معصیت کی وجہ سے سزا دیئے جاتے ہیں تو وہ اللہ تعالےٰ کا کافر ہے۔

(روح المعانی جلد اول صفحہ ۳۴۱)

لیکن مودودی صاحب نے چونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مسحور ہونے کے واقعہ کو سچا ثابت کرنا تھا۔ اس لئے وہ اس آیت کو یوں تفسیر فرماتے ہیں:۔

> اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں۔ مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لئے بھیجا ہوگا۔ جس طرح قومِ لوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازارِ ساحری میں اپنی دکان لگائی ہوگی اور دوسری طرف وہ اتمامِ حجت کے لئے ہر ایک کو خبردار کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو!

ہم تمہارے لئے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹ پڑتے ہوں گے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو ـــــ وہ سلطنتِ الٰہی کے کارپرداز ہیں، اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی گرد و پیش میں کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بری تھی تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خور حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں۔ تاکہ اُسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں، اور اس کے لئے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

(تفہیم القرآن - جلد اول - طبع اول - صفحہ ۹۸)

اس حکایت میں جو بچرپن اور لغویت ہے اسے ہم مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور امام فخرالدین رازی کی زبانی بیان کر چکے ہیں۔ یہاں یہ دیکھئے کہ مودودی صاحب کی بصیرتِ قرآنی نے جو بات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کی ہے کہ اس نے فرشتوں کو سی۔آئی۔ڈی کے بلا وردی سپاہیوں کی طرح اس دنیا کے انسانوں میں بھیجا تو اس سے خود اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیا تصور قائم ہوتا ہے۔!

جب طلوعِ اسلام نے لکھا تھا کہ یہ شخص یہ مشن لے کر یہاں آیا ہے کہ ملک کے ذہین طبقہ کو اسلام سے برگشتہ کر دیا جائے۔ تو مجھے اس پر یقین نہیں آتا تھا۔ لیکن ان کی ساری تفسیر کے گہرے مطالعے کے بعد کہ جس پر میں آٹھ قسطوں میں تبصرہ کر چکا ہوں۔ اور خصوصیت سے اس واقعہ کی تفسیر کے بعد میرے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں رہ جاتی جسے مودودی صاحب کے دفاع میں پیش کیا جا سکے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ ایسا اسلام پیش کر رہے ہیں جس سے نہ صرف یہ کہ اپنے ہاں کے ذہین طبقہ کو بلکہ یورپ کے غیر مسلم اربابِ فکر و نظر کو بھی جو اسلام کے قریب آتے دکھائی دیتے ہیں، اسلام سے متنفر کر دیا جائے، اور اسی تصور سے ہمارا کلیجہ شق ہو جاتا ہے، اور میرا یہی درد پنہاں تھا جو ان سطور کے لکھنے کا موجب بنا۔

پھر ہمارے ملک کے بڑے بڑے دانشور اس تفسیر کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ معلوم نہیں وہ یہ تعریف اس کے مطالعہ کے بعد کر رہے ہیں یا بغیر مطالعہ کئے۔ دونوں حالتوں میں ان کی حالت قابلِ رحم ہے۔

ادارہ طلوعِ اسلام کی

کتابوں کی قیمت میں خصوصی رعایت

ادارہ طلوعِ اسلام، ہر سال کنونشن کی تقریب پر اپنی شائع کردہ کتابوں کی قیمت میں خصوصی رعایت دیا کرتا ہے۔ ذیل میں ادارہ کی شائع کردہ تمام کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے۔ ان کتابوں پر جن کے سامنے رعایتی قیمت درج ہے، رعایت امسال بھی دی جائے گی۔ شرط یہ ہے کہ جو کتابیں مطلوب ہوں، ان کی قیمت بعد محصول ڈاک بذریعہ منی آرڈر ہمیں ۳۱ر اکتوبر ۱۹۷۵ء تک موصول ہو جائے۔ اس تاریخ کے بعد مطلوبہ کتابیں روانہ کر دی جائیں گی۔ اگر زیادہ کتابوں کا آرڈر دیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ محصول ڈاک میں کچھ بچت ہو جائے گی۔ اگر اس مد میں کسی کے کچھ پیسے ہمارے پاس بچ گئے تو ان کا بعد میں حساب کر دیا جائے گا۔ حسبِ سابق کنونشن کے موقع پر پنڈال کے ساتھ بک سٹال بھی قائم ہوگا۔ یہ کتابیں انہی رعایتی قیمتوں پر وہاں سے دستی بھی خریدی جا سکیں گی۔ جن کتابوں کی قیمت کے سامنے رعایتی قیمت درج نہیں، وہ پوری قیمت پر مل سکیں گی۔ چاہے بذریعہ ڈاک منگوائی جائیں یا بک سٹال سے دستی خریدی جائیں۔

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت	محصول ڈاک پیکنگ رجسٹری	نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت	محصول ڈاک پیکنگ رجسٹری
مفہوم القرآن پارہ اول	۴/-	۴/-	۱/۴۰	اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ ایڈیشن)	۱۵/-	۱۲/-	۱/۷۵
" " پارہ نمبر ۲ تا پارہ نمبر ۲۶	۲/۵۰ (فی پارہ)	۲/۵۰ (فی پارہ)	۱/۲۵ (فی پارہ)	اسلام کیا ہے؟ (سستا ایڈیشن)	۸/-	۸/-	۱/۵۰
" " پارہ نمبر ۲۸، ۲۹	۷/-	۷/-	۱/۴۰	من و یزداں	۲۵/-	۲۰/-	۲/-
" " پارہ نمبر ۳۰	۵/-	۵/-	۱/۴۰	جوئے نور	۲۵/-	۲۰/-	۲/-
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلد)	۱۱۰/-	۱۰۰/-	۶/-	ابلیس و آدم	۲۵/-	۲۰/-	۲/-
لغات القرآن (مکمل سیٹ)	۸۰/-	۷۰/-	۶/-	شعلۂ مستور	۲۵/-	۲۰/-	۲/-
انسان نے کیا سوچا	۲۰/-	۱۵/-	۲/۵۰	اقبال اور قرآن	۲۵/-	۲۲/-	۲/-
				جہانِ فردا (نقشِ ثانی)	۲۵/-	۲۵/-	۲/-

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت	محصول ڈاک پیکنگ رجسٹری
تبویبِ القرآن	۲۵/-	۲۰/-	۲/-
کتاب التقدیر (نقش ثانی)	۳۰/-	۲۵/-	۲/-
شاہکارِ رسالت	۴۵/-	۴۰/-	۲/۵۰
قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان	۱۵/-	۱۰/-	۱/۷۵
معراجِ انسانیت	۳۰/-	۳۰/-	۲/۵۰
سلسبیل	۱۰/-	۷/-	۱/۶۰
فردوسِ گم گشتہ	۱۰/-	۷/-	۱/۶۰
اسلامی معاشرت	۴/-	۳/-	۱/۲۵
اسبابِ زوالِ اُمت (اعلیٰ ایڈیشن)	۲/-	۲/-	۱/۲۵
اسبابِ زوالِ اُمت (سستا ایڈیشن)	۱/-	-/۵۰	۱/۲۵
جہاد	۲/۵۰	۲/-	۱/۲۵
قرآنی فیصلے (جلد اوّل)	۵/-	۴/-	۱/۲۵
قرآنی فیصلے (جلد سوم)	۵/-	۴/-	۱/۲۵
طاہرہ کے نام	۶/-	۵/-	۱/۲۵
پاکستان کا معمارِ اوّل	۳/۵۰	۲/-	۱/۲۵
سلیم کے نام (مکمل سیٹ)	۳۶/-	۳۰/-	۳/-

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت	محصول ڈاک پیکنگ رجسٹری
عربی خود سیکھئے	۷/-	۶/-	۱/۲۵
فجر الاسلام (جلد اول)	۵/-	۳/-	۱/۵۰
فجر الاسلام (جلد دوم)	۵/-	۳/-	۱/۵۰
اسلام پر کیا گذری	۸/-	۸/-	۱/۵۰
منزل بہ منزل	۸/-	۶/-	۱/۷۵
ISLAM A CHALLENGE (HARD BOUND)	۲۵/-	۲۵/-	۲/-
" " " (پیپر بیک)	۲۰/-	۱۶/-	۱/۷۵
قتلِ مرتد	۲/-	۱/-	۱/۲۵
عالمگیر افسانے	۱/-	-/۵۰	-/۱۵
ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت (مجلد نقش ثانی)	۱۵/-	۱۲/-	۱/۵۰
پرنسپلز آف لاء میکنگ اِن اسلام	۳/-	۲/-	۱/۲۵
جمع القرآن	۳/-	۲/-	۱/۲۵
تاریخ الامت (۷ جلدیں) پہلی تا چھٹی اور آٹھویں	۲۳/-	۱۵/-	۳/-
مفہوم القرآن (مکمل کھلے پارے ۱ تا ۳۰)	۸۱/-	۷۱/-	۵/-

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

طلوعِ اسلام کی اٹھارویں سالانہ کنونیشن!

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونیشن امسال بتوفیق ایزدی بتاریخ ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۵ء (بروز جمعرات، جمعہ، ہفتہ، اتوار) حسبِ سابق بمقام ۲۵۔ بی گلبرگ ۲ لاہور، منعقد ہو رہی ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے، نہ ہی اس کا کوئی اپنا فرقہ ہے، نہ اُمت سے الگ کوئی مسلک، نہ ہی یہ ملک کی عملی سیاسیات میں حصہ لیتا ہے۔ اس کا مقصد قرآنی فکر و تعلیم کا عام کرنا ہے، تاکہ اس سے قوم کے قلب و دماغ میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جائے جس سے قرآنی خطوط پر صحیح اسلامی نظام کے قیام کے لئے فضا سازگار اور زمین ہموار ہو جائے۔

۲:۔ کنونیشن کے کچھ اجلاس تو مندوبین تک محدود ہوتے ہیں اور کچھ کھلے اجلاس، جن میں عام سامعین بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کھلے اجلاسوں میں علاوہ دیگر مقالات، پرویز صاحب کے خطابات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ امسال ان کے پیشِ نظر حسبِ ذیل موضوعات ہیں:۔

(۱) استقبالیہ، جس کا عنوان ہے ــــ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں ــــ اس میں اُس خلفشار اور انتشار کا تحقیقاتی جائزہ لیا جائے گا جو اس وقت ساری دنیا میں عام ہو رہا ہے، اور جو اب پاکستان میں بھی سیلاب کی طرح امڈے چلا آرہا ہے۔

(۲) دوسرا خطاب، جس کا عنوان ہے ــــ وہ ہمارا خواب تھا، یہ خواب کی تعبیر ہے ــــ پاکستان کیوں حاصل کیا گیا تھا اور یہ کیا بن رہا ہے ــــ ایک بصیرت افروز تحقیقاتی تجزیہ۔

(۳) تیسرا خطاب ــــ جس مقام پر مارکس ناکام رہ گیا، اس سے آگے ــــ مارکس جس معاشی نظام کو ناممکن العمل قرار دے کر مایوس بیٹھ گیا تھا، قرآن کریم اُسے کس طرح ممکن ہی نہیں بناتا بلکہ اس سے آگے بھی جاتا ہے۔ دنیائے معاشیات کا ایک انقلاب آفریں، قابلِ عمل، نظریہ۔

۳:۔ حسبِ سابق ایک نشست بزمِ مذاکرہ کے لئے مخصوص ہوگی، جس میں قوم کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ (طلبا اور طالبات) حصہ لے گا۔ مذاکرہ کا موضوع ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم!
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

۴:۔ ایک نشست استفسارات کے لئے مخصوص ہوگی، جس میں محترم پرویز صاحب سامعین کے سوالات کا جواب قرآنی روشنی میں دیں گے۔

یہ پروگرام مشروط ہے۔ حتمی اور تفصیلی پروگرام وسط اکتوبر تک شائع ہو جائے گا، جس میں دیگر مقالات کی تفصیل بھی درج ہوگی۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

بابُ المراسلات

ایک اہم نکتہ کی وضاحت :-

میں نے اپنی کتاب ـــ شاہکارِ رسالت ـــ کے باب متعلقہ قانون سازی کے تحت لکھا ہے کہ :-

> قرآن کریم نے مسلمانوں کے لئے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح اور ان کے ہاں کا کھانا حلال قرار دیا ہے، لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی عورتوں سے، یہ کہہ کر نکاح کو ممنوع قرار دے دیا کہ یہ عورتیں، مسلمانوں کے معاشرہ میں فتنہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ (صفحہ ۲۷۹)

حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ بڑا مشہور ہے، لیکن ایک صاحب نے ایک تفصیلی خط کے ذریعہ اس کی وضاحت چاہی، جس کا میں نے خط کے ذریعہ جواب دیا۔ چونکہ سوال اور اس کا جواب عمومی اہمیت کا حامل ہے، اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ اسے طلوعِ اسلام میں شائع کر دیا جائے۔ اس لئے بھی کہ میں نے شاہکارِ رسالت میں اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ لیکن اب محسوس ہوا کہ ہو سکتا ہے کہ اس اجمال سے بعض دیگر قارئین کے دل میں بھی اسی قسم کا سوال پیدا ہو۔ لہٰذا اس کی وضاحت ضروری ہے۔

ان صاحب نے اپنے خط میں ایک طویل اصولی سی تمہید کے بعد جو اعتراض کیا ہے وہ بالاختصار یہ ہے :-

> میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ایک بشر کو، چاہے وہ خود صاحبِ کتاب ہی کیوں نہ ہو، یہ حق حاصل ہے کہ قرآن کی کسی بات کو معطل کر دے یا ممنوع قرار دے۔ قرآن کے کسی قاعدہ سے استنباط تو ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں اصل حکم باقی رہتا ہے۔ لیکن قاعدہ اور حکم کو ممنوع قرار دینا، میں سمجھتا ہوں بالکل غلط ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ کا علم ناقص ہے (نعوذ باللہ) کیا اس سے خدا کی حکمت پر حرف نہیں آتا کہ ایک ایسے مسئلہ کی اجازت دی جس میں فتنہ روپوش تھا...، جبکہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ اللہ علیم اور حکیم ہے۔ کیا اس سے خود قرآن مجروح نہیں ہوتا؟... کیا اس سے کھلی اجازت نہیں ملتی کہ جو امر آئے، مصلحتاً اس میں تغیر

تبدّل کر دے، چاہے وقتی ہی کیوں نہ ہو؟ کیا اس سے لاتبدیل لکلمت اللہ کی تردید نہیں ہوتی؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن کی تابعداری کی بجائے قرآن کو اپنے تابع بنایا جائے؟ کیا اِس سے جماعتِ اسلامی والے سچے ثابت نہیں ہوتے جو جھوٹ (حرام) کو مصلحتاً جائز قرار دیتے ہیں؟

میں نے اس کا حسبِ ذیل جواب دیا ہے:-

"محترمی! السلام علیکم

آپ کا تفصیلی گرامی نامہ موصول ہوا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ آپ نے ایک وضاحت طلب نکتہ کے متعلق ازالۂ شکوک کے لئے مصنف کی طرف رجوع کیا ورنہ آجکل تو یہ روش عام ہو رہی ہے کہ مصنف کی عبارات سے (غلط یا صحیح) خود ہی کوئی نتیجہ اخذ کر لیا جاتا ہے اور پھر اسے مصنف کی طرف منسوب کرکے اس کی تشہیر کی جاتی ہے۔ آپ نے جو سوال دریافت فرمایا ہے، اس کا جواب تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہے۔

۲:- قرآن کریم میں بعض امور کو حرام یا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور بعض کو حلال یا جائز ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دینے کا کسی کو حق یا اختیار حاصل نہیں۔ لیکن حلال کی صورت میں ایک بنیادی نکتہ پیش رکھنا ضروری ہے۔ حلال کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اس کی اجازت دی ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔ اس کا حکم نہیں ہے کہ تم ایسا ضرور کرو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو یہ معصیتِ خداوندی ہوگا۔ اس کی انفرادی مثال عام ہے۔ ہم بیسیوں ایسی حلال چیزیں نہیں کھاتے جو ہمیں پسند نہ ہوں۔ جن سے ہمیں طبعاً نفرت ہو۔ جو ناخوشگوار ہوں یا ہمارے مزاج اور طبیعت کے موافق نہ ہوں۔ ہم ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیتے، صرف خدا کی عطا کردہ اجازت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے۔ قرآنِ کریم نے حلال کے ساتھ جو طیّب کا اضافہ کیا ہے، تو طیّب میں یہ تمام باتیں شامل ہیں، جن کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔

۳:- یہ تو انفرادی مثال تھی۔ اسی کی اجتماعی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ برسات کے موسم میں، یا بعض وبائی امراض کے زمانہ میں، گورنمنٹ بعض چیزوں کے استعمال کو حکماً اور قانوناً ممنوع قرار دیدیتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ انہیں حرام قرار دے دیتی ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ حالات کا تقاضہ ایسا ہے کہ خدا کی اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ خدا کو اس کا علم نہیں تھا کہ بعض حالات میں ان چیزوں کا استعمال مضر ہوگا۔ یہ اعتراض اس صورت میں پیدا ہو سکتا تھا جب خدا یہ حکم دیتا کہ جو کچھ ہم نے حلال قرار دیا ہے، اُسے ہر شخص کو کھانا ہوگا اور ہر حال میں کھانا ہوگا۔ اس نے ایسا نہیں کہا۔ اس کی اجازت دے دی جس کے معنی یہ ہیں کہ ایسا کرنا ممنوع نہیں ہے، لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ معصیت نہیں ہوگی۔

اسی قسم کی ایک مثال آجکل ہمارے ہاں رائج ہے۔ حکومت نے سفید میں دو دن، حلال جانوروں کا ذبیحہ

اور اُن کا گوشت فروخت کرنا حکماً ممنوع قرار دیا ہوا ہے۔ مصالحِ کلّی کے پیشِ نظر ایسا کرنا بھی حلال کو حرام قرار دینا نہیں۔ لیکن اس قسم کا اجتماعی فیصلہ صرف حکومتِ مجاز کر سکتی ہے افراد نہیں۔ خواہ ان کی حیثیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

۴۔ اب آیئے نکاح کی طرف۔ پہلے انفرادی مثال لیجئے۔ چچا کی لڑکی کے ساتھ نکاح حلال ہے، یعنی اس کی اجازت ہے۔ اگر کوئی لڑکا اپنی چچازاد بہن کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تو اس کا یہ انکار قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر وہ یہ کہے کہ چچا کی لڑکی کے ساتھ نکاح حرام ہے، تو یہ قرآن کی مخالفت ہو گی۔

اب اسی مثال کی اجتماعی حیثیت سامنے لایئے۔ اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح حلال ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ اگر کوئی اہلِ کتاب قوم یہ سازش شروع کر دے کہ اپنی لڑکیوں کو مسلمانوں کے ساتھ نکاح کے ذریعہ جاسوس بنا کر بھیج دے، اور اسلامی مملکت کو اس کا علم یا اندازہ ہو جائے تو اُمت کے مصالحِ کلّی کے پیشِ نظر اسے اس کا اختیار ہو گا کہ وہ اِن حالات میں اس اجازت پر پابندی عائد کر دے۔ یہ نہ تو حلال کو حرام قرار دینا ہو گا اور نہ ہی معصیتِ خداوندی۔ یہ صرف خدا کی عطا کردہ ایک اجازت سے فائدہ نہ اٹھانے کا فیصلہ ہو گا۔ جب یہ مصلحت باقی نہیں رہے گی یہ پابندی اٹھا دی جائے گی، لیکن اس قسم کا اجتماعی فیصلہ اسلامی حکومت ہی کر سکتی ہے کوئی فرد نہیں۔ ایسا ہی حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ عیسائی حکومتیں اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگ گئیں تھیں۔ ان کی عورتیں مسلمانوں کے معاشرہ میں داخل ہو کر جاسوسی کرنے لگ گئیں تھیں۔ اس قسم کی عورتوں نے اسلامی مملکتوں کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے، تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ لیکن جہاں اس قسم کی مضرّت کا احتمال نہ ہو، وہاں اس اجازت پر پابندی کی ضرورت نہیں ہو گی۔

۵۔ مجھے امید ہے کہ اس صراحت سے اس نکتہ کی وضاحت ہو گئی ہو گی اور آپ کا شبہ بھی دفع ہو گیا ہو گا۔ اس سے عند المصلحت جھوٹ بولنے یا فریب دینے کا شرعی جواز نہیں نکل سکتا۔ جھوٹ بولنا یا فریب دینا ممنوع ہے۔ ان کی صورت یہ نہیں کہ خدا نے یہ کہا ہو کہ جھوٹ بولنا یا فریب دینا حلال ہے تمہارا جی چاہے جھوٹ بول لیا کرو اور جی چاہے تو نہ بولا کرو۔ یہ ہے فرق، حلال اور حرام یا جائز اور ممنوع میں! ۔

اگر کوئی نکتہ مزید وضاحت کا متقاضی ہو تو مجھے مطلع فرمایئے گا۔

والسلام

مجھے امید ہے کہ اگر کسی صاحب کے دل میں حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کے متعلق اسی قسم کا شبہ پیدا ہوا ہو گا، تو اس وضاحت سے وہ شبہ زائل ہو گیا ہو گا۔ (پرویز)

ارباب حکومت کو کون جگائے!

مردان سے ایک صاحب نے ہمیں اپنے گرامی نامہ کے ساتھ ایک مضمون کے اقتباس کی نقل بھیجی ہے۔ یہ مضمون ہفتہ وار اخبار "لاہور" کی ۱۸ر اگست ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اور اس کے آغاز میں یہ لکھا ہے۔ "اسلام آباد سے ایک سینئر ایڈووکیٹ رقمطراز ہیں" مضمون کا اقتباس حسب ذیل ہے:۔

"میں ان چند سطور کے ذریعے آج ایسی غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ جس میں صرف وطن عزیز کے بعض اونچے مرتبے کے علمائے کرام اور صحافی حضرات ہی نہیں وکالت ایسے غیر جانبدار پیشے کے ارکان بھی مبتلا ہیں۔ مقصود کسی کی دل جمعی یا دل شکنی نہیں۔ بلکہ محض اصل حقیقت کا اظہار ہے۔۔۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو قومی اسمبلی نے آئین میں جو ترمیم کی ہے۔ اس میں احمدیوں یا قادیانیوں کو "غیر مسلم" (NON MUSLIM) ہرگز قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ اس فرقہ کے لوگ قانون اور آئین کے اغراض کے لئے "مسلم نہیں" (NOT MUSLIM) ہیں۔۔۔ گویا دیگر تمام اغراض (مذہبی۔ عمرانی۔ تہذیبی۔ علمی۔ مجلسی وغیرہ) کے لئے وہ "مسلم" ہی متصور ہوں گے اور ان کی یہ حیثیت قومی اسمبلی کو تسلیم ہے۔ دوسرے لفظوں میں قومی اسمبلی کی یہ ترمیم بھی احمدیوں کے "مسلم" ہونے کی توثیق کرتی ہے۔ سوائے دو اغراض کے۔ اگر جذبات اور ذاتی خواہشات کو ایک طرف رکھ کر "نان مسلم" اور "ناٹ مسلم" کے الفاظ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو ان دونوں میں فرق سمجھ میں آ جانا چنداں مشکل نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس فیصلے سے دلچسپی رکھنے والے بیشتر حلقوں نے خواہ مخواہ لفظ "غیر مسلم" کی رٹ لگا رکھی ہے۔

اس معاملہ میں عوام الناس تو قابلِ معافی ہیں کہ انہیں آئینی زبان کے رموز و غوامض سے آگہی نہیں ہوتی۔ ہنسی بلکہ رونا تو اس وقت آتا ہے۔ جب اپنے آپ کو بڑا ماہر و مشاق، وقت کی زبان اور ملت کے ترجمان سمجھنے والے صحافی حضرات اپنی اس غیر آئینی تفہیم کی بنا پر حکومت سے بعض مضحکہ خیز قسم کے مطالبات شروع کر دیتے ہیں۔ بلکہ اس قسم کے الزام عائد کرنے لگتے ہیں کہ دیکھئے قومی اسمبلی کی ترمیم کے باوجود یہ لوگ اپنے آپ کو "غیر مسلم" (NON MUSLIM) تسلیم نہیں کرتے حالانکہ جب کسی جماعت کو "نان مسلم" (غیر مسلم) قرار ہی نہیں دیا گیا، تو وہ اپنے ماتھے پر صرف اس لئے یہ ناپسندیدہ لیبل کیوں چپکا لے کہ بعض کم علم اور بے بصیرت لوگ قومی اسمبلی کی ترمیم کا مفہوم نہیں سمجھے۔۔۔"

(باقی ہر صفحہ ۳۰)

حقائق و عبر

۱۔۔۔ اور آپ کے اسلام میں؟

آجکل جماعت اسلامی کے اخبارات میں، مودودی صاحب کا حسب ذیل فقرہ اکثر و بیشتر، چوکھٹوں میں لکھ کر شائع کیا جاتا ہے۔

سوشلزم وہ پھندا ہے جو اپنی خوشی سے گلے میں ڈالا تو جا سکتا ہے، لیکن اپنی خوشی سے اتارا نہیں جا سکتا۔ (ہفت روزہ ایشیا۔ ۳۱ اگست ۱۹۷۵ء)

مودودی صاحب اپنے پیش کردہ اسلام کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

لا اکراہ فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کے لئے مجبور نہیں کرتے۔ اور واقعی ہماری روش یہی ہے۔ مگر جسے آکر واپس جانا ہو، اسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کے لئے کھلا ہوا نہیں ہے۔ لہٰذا اگر آتے ہو تو یہ فیصلہ کر کے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے۔ ورنہ براہِ کرم آؤ ہی نہیں۔ (مرتد کی سزا قتل۔ اسلامی قانون میں۔ ص۵۳)

اور جو آنے کے بعد جائے، مودودی صاحب کی شریعت میں اس کی سزا موت ہے۔

ہم پوچھنا چاہتے ہیں مودودی صاحب کے متبعین سے کہ اس باب میں سوشلزم اور مودودی صاحب کے تصور کے اسلام میں کیا فرق ہے؟

۲۔ جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے!

مودودی صاحب کا فتویٰ ہے کہ زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہو جاتا ہے، اور اس کا عملی ثبوت خود ان کی سیاست میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ (مثلاً) انہوں نے کہا ہے۔

قراردادِ پاکستان میں بہ حیثیت قوم ہمارا مطالبہ یہ تھا۔ ہمیں ایک خطۂ زمین چاہیئے

جس میں ہم اپنی تہذیب و تمدن کو از سرِ نو قائم کر سکیں اور اپنے دین کے اصولوں پر اپنی زندگی کو نشوونما دے سکیں۔ کیونکہ ایک غیر مسلم اکثریت کے تحت ہمارے لئے اس طرح کی زندگی ممکن نہیں ہے۔ (ایشیا۔ ۲۴ اگست ۱۹۷۵ء)

جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے قراردادِ پاکستان ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور ہوئی تھی۔ لیکن مودودی صاحب نے اپنی کتاب 'سیاسی کشمکش' حصہ سوم میں 'جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی، لکھا تھا:۔

اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

(سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم۔ طبع دارالاسلام۔ صفحہ ۱۳۰ حاشیہ)

آپ مودودی صاحب کے ان دونوں اقتباسات کا مقابلہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ کس قدر جرأت مندانہ جھوٹ تھا جو ۱۹۴۱ء میں بولا گیا تھا۔ واضح رہے کہ ۱۹۴۰ء میں مودودی صاحب یہیں پنجاب ہی میں بیٹھے تھے۔ (اور غالباً لاہور میں) جب قراردادِ پاکستان منظور ہوئی ہے۔

۳۔ ہماری دیانت اور صحافت

اگست کے آخری ہفتہ میں، لاہور میں، علامہ مشرقی کی برسی منانے کے سلسلہ میں، اخبارات میں ایک اجتماع کا اعلان ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ اس میں (منجملہ دیگر حضرات) پرویز صاحب بھی خطاب کریں گے۔ پرویز صاحب نے اس جلسہ کے منتظمین سے رابطہ پر کہا کہ ان کی اجازت یا رضامندی کے بغیر مقررین کی فہرست میں ان کا نام کس طرح شامل کر دیا گیا ہے تو انہوں نے کہا کہ سہواً ایسا ہو گیا ہے — وہ اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ لیکن اس کے بعد دو تین دن تک اعلان بدستور شائع ہوتا رہا۔ اس سے پرویز صاحب کا نام حذف نہیں کیا گیا۔ چنانچہ بہت سے لوگ ان کا خطاب سننے کے لئے جلسہ میں چلے گئے اور نہایت مایوس لوٹے۔ جلسہ میں بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ پرویز کا نام سہواً درج ہو گیا تھا۔ چنانچہ (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) اہل مایوس حضرات نے یہی تاثر لیا کہ یہ لوگ وعدہ کر لیتے ہیں اور پھر ایسے ایفا نہیں کرتے۔ کچھ احباب نے پرویز صاحب سے اس کی شکایت بھی کی، اور جب انہیں حقیقت سے آگاہ کیا گیا تو انہیں تعجب ہوا۔

لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز اس افسانے کا اگلا ٹکڑا ہے۔ پاکستان ٹائمز (لاہور) کی ۲۸ اگست کی اشاعت میں، اس جلسہ کی روئداد (اخبار کے سٹاف رپورٹر کی وساطت سے) شائع ہوئی ہے۔ اس میں مختلف مقررین کی تقاریر کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

مسٹر غلام احمد پرویز نے بھی مجمع سے خطاب کیا۔

حالانکہ "مسٹر غلام احمد پرویز اس وقت اپنے مکان پر بیٹھے طلوعِ اسلام کنونشن کے سلسلہ میں احباب سے مشورہ کر رہے تھے۔

اور جن دوستوں کے استفسار پر پرویز صاحب نے کہا تھا کہ اخبار کے اعلان میں ان کا نام یونہی سہواً درج کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے یہ رپورٹ دیکھ کر پرویز صاحب سے کہا کہ آپ نے تو کہا تھا کہ میں اس جلسہ میں نہیں جا رہا ــــ پھر آپ کیسے چلے گئے؟

یہ ہے ہماری صحافت! اور اسی صحافت کی "سندوں" سے ہمارے دور کی تاریخ مرتب ہو گی۔

۴۔ پھر "احمدیوں" کا مسئلہ

ہم نے طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۷۵ء کے شمارہ میں "احمدیوں" کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگرچہ آئینی طور پر انہیں (خواہ وہ لاہوری ہوں یا ربوی) غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے۔ لیکن اس فیصلہ کے عواقب میں پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے سلسلہ میں قانونی اقدامات ابھی تک نہیں کئے گئے حتیٰ کہ الفضل نے یہاں تک بھی اعلان کر دیا کہ دستوری فیصلہ کے باوجود ہم اپنے آپ کو غیر مسلم نہیں لکھیں گے۔ "احمدی مسلمان" ہی لکھیں گے۔ اس پر بھی حکومت نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس کے برعکس حکومت کی طرف سے آئے دن حلف نامے شائع کئے جاتے ہیں اور ان کی اس رعونت سے پبلسٹی کی جاتی ہے، گویا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ حالانکہ بغور دیکھا جائے تو نظر آ جائے گا کہ ان حلف ناموں کی اوٹ میں اصل حقیقت سے اغماض برتا جا رہا ہے۔

اب حال میں، سابقہ حلف ناموں میں ایک اور کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ حلف نامہ (جس کے الفاظ وہی ہیں جو دستور میں درج تھے۔) ان لوگوں سے لیا جائے گا جو حج پر جائیں گے۔ اس ضمن میں دو ایک سوالات ابھرتے ہیں جو قابلِ غور ہیں۔

(۱) "احمدی" (لاہوری یا ربوی دونوں) قانوناً غیر مسلم ہیں۔

(۲) اگر کوئی غیر مسلم اپنے آپ کو مسلمان کہے یا لکھے، تو کیا اس کا یہ فعل قانوناً جرم ہے یا نہیں ــــ اگر جرم ہے تو اس کی سزا کیا ہے۔

(۳) کیا غیر مسلموں کو بھی حج پر جانے کی اجازت دی جا سکتی ہے؟ اگر نہیں دی جا سکتی۔ (جیسا کہ ظاہر ہے کہ نہیں دی جانی چاہیئے) تو پھر "احمدیوں" کے حج کے لئے درخواست دینے یا انہیں حج کے لئے اجازت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۴) اگر "احمدیوں" کی پوزیشن یہی ہے تو پھر اس حلف نامہ کا مقصد کیا ہے؟ یہ کن لوگوں سے لیا جائے گا؟ "احمدیوں" سے نہیں لیا جائے گا، کیونکہ وہ غیر مسلم ہیں۔ اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے (احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دینے کے بعد) پاکستان میں کوئی مسلمان بھی ایسا نہیں رہ جاتا، جو

نبی اکرمؐ کے آخری نبی ہونے پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ اس لئے ان سے ایسا حلف نامہ لینے کے معنی کچھ نہیں۔

کیا وزارتِ امورِ مذہبیہ (حکومتِ پاکستان) براہِ کرم ان امور کی وضاحت کرے گی؟ ہم نے متعدد بار یہ تجویز پیش کی ہے کہ اس قسم کے حلف نامے لکھانے، ہر اس فارم میں جس میں "مذہب" کا اظہار ضروری ہو، یہ درج کر دینا کافی ہوگا کہ:

میں مسلمان ہوں ("احمدی" نہیں ہوں) اور مرزا غلام احمد قادیانی کو مسلمان نہیں سمجھتا۔

بات واضح اور دوٹوک ہو جائے گی۔ معلوم نہیں اس تجویز کے اختیار کرنے میں حکومت کے لئے کونسا امر مانع ہے......؟

۵۔ نہلے پہ دہلا!

علامہ مشرقی کی برسی کے سلسلہ میں اجتماع میں، پرویز صاحب کے نام کے متعلق اوپر شذرہ لکھا جا چکا تو ایک دوست کی وساطت سے ایک اور "تجرنامہ" موصول ہوا جو اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ پاکستان نیشنل سنٹر۔ لاہور۔ وفاقی حکومت کا پبلسٹی ادارہ ہے۔ اس ادارہ کی طرف سے ماہ ستمبر ۱۹۷۵ء کا پروگرام (سائیکلوسٹائیلڈ) شائع ہوا ہے۔ جس میں ایک شق حسب ذیل ہے۔

اسلامی سوشلزم کا تاریخی جائزہ

۵ ستمبر ۷۵ء
شام پانچ بجے
بروز جمعہ

صدر:۔ ڈاکٹر عبدالخالق
وزیر خزانہ پنجاب
مقررین:۔ جناب غلام احمد پرویز۔ محترمہ عابدہ حسین۔ جناب حمید جہلمی۔

پروگرام کے نیچے (محترمہ) کشور ناہید (صاحبہ) ریذیڈنٹ ڈائریکٹر کے دستخط ثبت ہیں۔

پرویز صاحب نے بتایا کہ انہیں اس پروگرام کا آج (۱۳ ستمبر کو) پہلی مرتبہ علم ہوا ہے۔ ان سے نہ اس پروگرام کی اشاعت سے پہلے کسی نے پوچھا۔ نہ اس کے بعد اطلاع دی۔ نہ انہیں ۵ ستمبر کے اجتماع کا کوئی علم ہے۔ ہمارے اس دوست نے بتایا کہ پرویز صاحب کے نام کی وجہ سے بہت سے لوگ اس اجتماع میں گئے۔ وہاں نہ پرویز صاحب موجود تھے اور نہ ہی منتظمین میں سے کسی نے اعلان کیا کہ وہ کیوں نہیں آئے۔ سامعین حسبِ معمول پرویز صاحب کو کوستے چلے گئے کہ یہ بھی اب لیڈر بن گئے ہیں۔ وعدہ کر لیتے ہیں اور آتے نہیں۔ اور لوگوں کو خواہ مخواہ پریشان ہونا پڑتا ہے۔

یہ ہمارے حکومتی اداروں کی حالت ہے؟ آپ نے دیکھا کہ جب جھوٹ اور فریب ذہنی معاشرہ کا عام

شعار ہو جائے تو اس سے کوئی گوشہ بھی محفوظ نہیں رہتا۔

۲۔ پہلے گھر کی خبر لیجئے!

ایک دوست کی وساطت سے، ایک گشتی مراسلہ کی کاپی موصول ہوئی ہے۔ یہ شائع ہوا ہے "نیشنل کونسل اوف کلچر اینڈ آرٹس، کراچی" کی طرف سے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ ادارہ وفاقی وزیر، مولانا کوثر نیازی صاحب کی زیرِ سرپرستی قائم ہوا ہے۔ اس کی طرف سے، زیرِ ہدایت مولانا صاحب، اکتوبر ۷۵ء میں ایک سمینار منعقد کیا جائے گا۔ جس کا مقصد یہ ہوگا کہ پاکستان میں جو چار/ پانچ قومیتوں اور چار/ پانچ ثقافتوں کا پروپیگنڈہ عام ہو رہا ہے، اس کی روک تھام کا اہتمام کیا جائے اور ایک ایسی تحریک چلائی جائے جس کا مقصد "ایک قوم۔ ایک کلچر" ہو۔ مراسلہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مجوزہ سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت محترم صدرِ مملکت یا محترم وزیرِ اعظم پاکستان فرمائیں گے۔

اس سمینار کا مقصد بڑا مبارک ہے اور ہم اس کی کامیابی کے متمنی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس کے موضوع میں "ایک قوم" سے مراد "مسلم قوم" ہے نہ کہ مسلم اور غیر مسلم پر مشتمل "ایک پاکستانی قوم"۔ اور "ایک کلچر" سے مقصود نظریۂ پاکستان (یا اسلامی شعارِ زندگی) ہے، نہ کہ کسی خاص قوم کا کلچر۔

لیکن اس سلسلہ میں ہم اس ادارہ کے سرپرست، محترم کوثر نیازی صاحب سے ایک سوال پوچھنے کی جرأت کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ملک میں چار/ پانچ قومیتوں اور چار/ پانچ ثقافتوں کا پروپیگنڈہ کس کی طرف سے ہو رہا ہے، جس کی روک تھام کے لئے یہ اہتمامات کئے جا رہے ہیں؟ دنیا جانتی ہے کہ اس فتنہ کا سرچشمہ فیض احمد فیض صاحب ہیں۔ جو خود حکومتِ پاکستان کے زیرِ عاطفت، اسلام آباد میں بیٹھے، اسے عام کر رہے ہیں۔ اور حکومت کے ذرائع ابلاغ (ریڈیو، ٹیلی ویژن، مختلف تقاریب وغیرہ) اس کا ذریعۂ نشر و اشاعت ہیں، اور یہ سلسلہ اس زمانہ سے جاری ہے۔ جب خود محترم کوثر نیازی صاحب وزیرِ اطلاعات تھے۔ یعنی، ایک طرف خود حکومت کے زیرِ عاطفت اس فتنہ کو عام کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اسی حکومت کے ایک وزیر اس کی روک تھام کے لئے تحریک چلانے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ جسے (مراسلہ میں شائع شدہ تجویز کے مطابق) خود صدرِ مملکت / وزیرِ اعظم کی تائید حاصل ہے۔ کیا نیازی صاحب فرمائیں گے کہ یہ معمہ کیا ہے.....!

۱۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی خط بھیجئے۔ ورنہ تعمیل نہیں ہوگی۔
۲۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔
۳۔ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک پرچہ نہ ملنے کی شکایت پر پرچہ بلاقیمت بھیجا جائے گا۔ اس کے بعد قیمتاً بھیجا جائے گا۔

(بقیہ:- باب المراسلات (صـ۲۴ سے آگے))

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ قانونی نقطۂ نگاہ سے (NON - MUSLIM) اور (NOT MUSLIM) میں کیا فرق ہے ـــــ لیکن ایک عام آدمی کی حیثیت سے ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ آئینی ترمیم میں جہاں "احمدیوں" کو (NOT MUSLIM) کہا گیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس فیصلہ کی رُو سے ان کا شمار غیر مسلم اقلیتوں، مثل عیسائی، ہندو، سکھ، بدھسٹ، پارسی یا شیڈول کاسٹ میں ہوگا۔ کیا اس سے بات صاف نہیں ہوتی؟

"احمدی" حضرات کا یہ اضطراب قابلِ فہم ہے۔ لیکن ناقابلِ فہم ہے وہ مہرِ سکوت، جو ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کے بعد ہمارے اربابِ حکومت کے لبوں پر لگ گئی ہے۔ ہم اُس وقت سے آج تک مسلسل چلّا رہے ہیں کہ آئینی ترمیم کے عواقب میں پیدا ہونے والے مسائل کے سلسلہ میں ضروری قوانین وضع کئے جائیں۔ جب تک ایسا نہیں کیا جائے گا، یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے جیسے یہ حضرات کہیں اصحابِ کہف کے ساتھ سو رہے ہیں۔ ان کی طرف سے نفی اثبات، تردید تائید کے طور پر ایک لفظ تک نہیں شائع ہو رہا۔ بجز ندوین حلف ناموں کے، جن کے اسقام کی طرف ہم انہی صفحات میں اُن کی توجہ مبذول کرا چکے ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ کونسی مصلحتیں ان کے دامنگیر ہیں جو ایسے اہم معاملہ کے راستہ میں لٹک بن کر کھڑی ہو رہی ہیں۔ ہم تو ڈر رہے ہیں کہ اُن کے اس طرزِ عمل سے یہ مسئلہ پھر سے ملک میں انتشار کا باعث نہ بن جائے۔ خدا ہمیں اس سے محفوظ رکھے، کہ اب یہ ملک کسی مزید انتشار کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔

شاباش!

طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۷۵ء میں ہم نے، عزیز سعد حسن بشیر کا ایک مقالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا ـــــ خرد کو غلامی سے آزاد کر ـــــ وہ مقالہ پاکستان سٹوڈنٹس یوتھ کونسل کے زیرِ اہتمام منعقدہ یومِ اقبالؒ کی تقریب پہ مضامین نویسی کے مقابلہ کے سلسلہ میں لکھا گیا تھا۔ اب عزیز موصوف نے اخبار ڈان، کراچی (بابت ۸ر ستمبر) کا تراشہ بھیجا ہے جس میں اعلان چھپا ہے کہ اس مقالہ کو فرسٹ قرار دیا گیا ہے اور پانچ سو روپیہ کے انعام کا مستحق۔ منصفین حضرات، مسٹر قدیرالدین احمدؔ، (غالباً سابق جج ہائی کورٹ) ڈاکٹر حسن اور مسٹر شان الحق حقیؔ تھے۔ ہم عزیز بشیر کو اس کی اوّلیں کوشش کی اس نمایاں کامیابی اور جج صاحبان کی جوہر شناسی پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

جشنِ نزولِ قرآنِ مجید پر ہدیۂ تبریک

دنیا کی ہر قوم کوئی نہ کوئی تہوار مناتی ہے۔ ہم بھی سال کے مختلف دنوں میں بعض تہوار مناتے ہیں۔ لیکن عیدالفطر کا تہوار وہ ہے جسے بطور جشنِ مسرت منانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے۔ اس سے اس تہوار کی اہمیت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ اے نوعِ انسان! تمہاری طرف تمہارے نشوونما دینے والے کی جانب سے ایک ضابطہ و قوانین نازل ہوا ہے جو انسانیت کے تمام امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے۔ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ اور ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں، سامانِ نشوونما اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی راہ نمائی ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے ہے کہ ایسا عدیم النظیر ضابطۂ زندگی عطا ہو گیا۔ اگر ساری دنیا کے انسان مل کر بھی کوشش کرتے تو اس جیسا ضابطہ نہ مل سکتا۔ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ تمہیں چاہیئے کہ ایسی متاعِ گراں بہا کے اس طرح بے مزد و معاوضہ مل جانے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ وہ متاعِ گراں بہا کہ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ (۱۰/۵۸) انسان جو کچھ بھی جمع کرے۔ یہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ متاعِ کائنات سے زیادہ گراں بہا۔ سامانِ زیست سے زیادہ بیش قیمت۔

یہ ہے وہ تقریبِ جاں نواز جسے بطور جشن بہجت و مسرت منانے کی تاکید خدا نے کی ہے۔ یعنی جشنِ نزولِ قرآن، اور نزولِ قرآن کی ابتدا چونکہ رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔ (۲/۱۸۵) اس لئے رمضان کا پورا مہینہ اس جشن کی تیاریوں کا تھا اور عیدالفطر اس جشن کی تکمیل کا دن۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ جشن اب محض ایک رسم بن کر رہ گیا ہے، بے روح۔ اور اس تقریب کے منانے والوں کو اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ یہ تقریب منائی کیوں جاتی ہے۔ یہ اسی لئے کہ ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں — عیدِ محکوماں، ہجومِ مؤمنین

لیکن طلوعِ اسلام تو ابھی فراموش کردہ حقیقتوں کی یاددہانی کا ذریعہ ہے۔ اس لئے ہم اس تقریب کو اس لئے مناتے ہیں کہ جس انقلاب آفریں عظیم القدر واقعہ کی نسبت سے اس تقریب کے منانے کا حکم دیا گیا تھا، اس کی یاد تازہ ہو جائے۔

اور یہی ہے وہ مقصد جس کے پیشِ نظر ہم اپنے ہزارہا قارئین کی خدمت میں لطیف و شیریں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

والسلام

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم	**لاہور** ہر اتوار صبح ۸½ بجے فون ۸۰۸۰۰ ۲۵-بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن)
لائلپور ہر جمعہ ۵½ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) فون ۲۴۹۴۳ ۶۵ کوتوالی روڈ نزد حیات سرجیکل کلینک	**ملتان** ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب (بذریعہ ٹیپ) فون ۲۰۷۱ دفتر شاہ سنز۔ بیرون پاک گیٹ
سیالکوٹ ہر اتوار ۸½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) ٹی سٹال چوہدری محمد دین۔ کرسچن ٹاؤن بارہ پتھر	**کراچی** ہر اتوار ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) فون ۶۱۰۴۹۸ دفتر بزمِ طلوعِ اسلام ۔ دارالقائد ۲۰-۱/بی ناظم آباد ۲
راولپنڈی ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی۔۱۶۶۰ - لیاقت روڈ	**گجرات** ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ - نیز بروز اتوار ۴ بجے شام - بمقام ۱۲-۱-بی عجمیر روڈ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared,
and die not except in a state of Islam. And hold fast,
all together, by the Rope which God stretches out
for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

لاہور میں قیام کے لئے
پارک وے ہوٹل
PARK WAY
فون ۵۲۲۵۹

صاف ستھرے ہوادار کمرے مناسب شرح پر
نیز
عمدہ - لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کے لئے
معیاری طعام گاہ
آپ کی تشریف آوری کا شکریہ
مینجر پارک وے ہوٹل نزد ریلوے اسٹیشن لاہور

حیاتِ قائدِ اعظمؒ

کے

(نمایاں خط و خال)

(۲)

تحریکِ آزادیٔ ہند اور ہندو مسلم اتحاد کی پچیس سالہ جد و جہد میں قائدِ اعظمؒ نے جس مثالی کردار کا مظاہرہ کیا اس کی تفصیلات اشاعتِ ماسبق میں سامنے آچکی ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء تک ان عظیم الشان مساعی میں ان کی تمام سعی و کاوش کا مرکز و محور یہ رہا کہ کانگرس و مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے ہندو مسلم اتحاد کا وہ پلیٹ فارم تعمیر کیا جائے جو غیر ملکی سامراج کے لئے ملکی اتحاد کا ایک مستقل چیلنج ثابت ہو اور پھر دو قوموں کے باہمی اتحاد کی اس عظیم قوت سے غلامی اور محکومی کے وہ بندھن توڑے جا سکیں جنہوں نے کروڑوں انسانوں کے شرفِ انسانی کو پامال اور ان کی توانائیوں کو معطل کر رکھا تھا۔ اتحاد و آزادی کی ان شبانہ روز کوششوں میں وہ سالہا سال تک اس قدر دیوانہ وار جذب رہے کہ ملکی اخبارات نے برملا شہادت دی کہ:۔

مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں سے کبھی اکتاتے نہیں!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

لیکن اس مسلسل اور جان توڑ مساعی کا کیا صلہ ملا؟ تاریخِ آزادی کے اوراق پوری وضاحت سے اس سوال کا جواب دے رہے ہیں۔ کانگرس کا مہاسبھائی ذہن قدم قدم پر ان قابلِ قدر مساعی کے خلاف برسرِ پیکار رہا۔ اس کے یہ ناپاک عزائم اور مخفی سازشیں کبھی ماند نہ پڑ سکیں کہ برطانوی سامراج کی جانشینی کے لئے رام راج کے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے اور انگریز کی غلامی کی زنجیروں کے ٹوٹتے ہی اس برصغیر کی پوری آبادی کو اشوک کے چکر اور برہمنی تہذیب و تمدن کی ان زنجیروں میں جکڑ دیا جائے جن کی جمہوری قبا اپنی نمائشی اور پُر فریب چمک دمک سے نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہو۔

میثاقِ لکھنؤ سنہ ۱۹۱۶ء قائدِ اعظمؒ کی کاوشِ اتحاد کا عظیم شاہکار تھا اور مہاسبھائی سازشوں نے اسے جس حسرت و یاس کا شکار بنایا اس کی المناک داستان آج شرمندۂ بیان اور رہینِ تشہیر نہیں رہی۔ آزادی و اتحاد کی اس مخلصانہ

سیاسی جنگ میں ہارتا اور ستیہ گرہ کی بوالعجبیوں کو جن گہری چال سے بروئے کار لایا گیا اور ہر فیصلہ کن موڑ پر گاندھی جی کی تحریک جس طرح بلا وجہ اور اچانک طور پر ابھر کر منظرِ عام پر آتی رہی۔ بمبئی کی آل پارٹیز کانفرنس اور کلکتہ کی آل پارٹیز نیشنل کنونشن کو ناکام بنانے کے لئے جس قسم کے افسوسناک ہتھکنڈے حرکت میں لائے گئے، اور پھر پہلی گول میز کانفرنس میں جو منافرت انگیز ڈرامہ کھیلا گیا یہ تمام سلسلۂ دراز اس حقیقت کا کھلا کھلا اعلان تھا کہ ان تلخ اور ناکام تجربات کو مزید جاری رکھنا سیاسی تدبر و فراست کے لئے کوئی خوشگوار اور نیک فال ثابت نہیں ہوگا۔

انقلابِ عظیم

۱۹۳۱ء کے آغاز میں پہلی گول میز کانفرنس جس بری طرح ناکام ہوئی اس کے تلخ ترین انجام سے محمد علی جناحؒ جیسے صاحبِ عزم سیاست دان کے ذہن میں جو سوال ابھر سکتا تھا (اور یقیناً وہ ابھرا) وہ یہی تھا کہ اب کیا ہو؟ یہی ہے سیاسیاتِ ہند کا وہ نازک اور فیصلہ کن مرحلہ جہاں سے جناح کی تگ و تاز ایک عظیم فکری و نظری انقلاب کی روشنی میں ایک نیا موڑ مڑتی ہے ـــــ وہ انقلاب جس نے ایشیا کی تاریخ کو بدل کے رکھ دیا اور عالمِ اسلام کو ایک نئی صبحِ بہار کی تابناکیوں سے لذت شناس کیا۔ یہی انقلاب تھا جو تحریکِ پاکستان کا پس منظر قرار پایا اور اسی حرفِ آغاز سے دس کروڑ مسلمانوں کی وہ جدوجہد حاصلِ تکمیل کو پہنچی جس کے برگ و بار مملکتِ پاکستان کے محسوس و مشہود پیکروں میں کشت زارِ سیاست کا شاہکار قرار پائے۔

فکر و نظر کا یہ انقلاب ہمیں اس مقام تک لے آیا ہے جہاں تحریکِ پاکستان اور اس کا پس منظر نجومِ سحر کی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے جگمگا اٹھتے ہیں اور سرزمینِ مشرق کی اس عظیم ترین اور انقلاب آفریں تحریک کا قافلہ سالار، کاروانِ ملت کو اپنے جلو میں لئے فاتحانہ شان سے قدم بڑھاتا نظر آتا ہے۔ بڑا ہی نازک تھا یہ مرحلہ، اور بڑی ہی صبر آزما تھی یہ منزل۔ تین صدیوں کی مسلسل بے حسی، سیاسی زوال اور ذہنی شکست کے بعد اس برصغیر کی ملتِ اسلامیہ، وحدتِ فکر و عمل سے ہم آہنگ اور احساسِ خودی کے ولولوں سے سرشار ہو کر والہانہ انداز سے کارگہِ سیاست میں صف آرا ہوتی ہے، اور دس سال کی مختصر سی مدت میں اس کی فاتحانہ یلغاریں ایک اذانِ انقلاب بن کر سیاسی فضاؤں میں گونج اٹھتی ہیں۔

تحریکِ پاکستان کا منتہا و مقصود

کیا تحریکِ پاکستان کی یہ داستانِ انقلاب دو سیاسی پارٹیوں کی باہمی چپقلش کے نام کے مترادف تھی؟ کیا یہ سب کچھ کسی فرقہ وارانہ یا انتقامی روش کی پیداوار ہے جسے جناح مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کانگریس کے خلاف بروئے کار لائے؟ کیا یہ کوائف شاطرانِ فرنگ کی مہرہ بازیوں کا طے شدہ کرشمہ تھے؟ تاریخ کے بین السطور سے جو حقائق ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ پکار پکار کر صاف اور واشگاف الفاظ میں اعلان کر رہے ہیں کہ ایسا قطعاً اور ہرگز نہ تھا۔ بلکہ یہ تصادم تھا زندگی کے دو مختلف تصورات کا۔ یہ آویزش تھی دو متضاد نقطہ ہائے حیات کے تقاضوں کی۔ یہ ٹکراؤ تھا دو جداگانہ ثقافتوں کا۔ یہ جنگ تھی دو قوموں کے متخالف رجحانات کی۔ یہ انقلاب آفریں معرکہ آرائی تھی دین و وطن کے دو متقابل خداؤں کی۔ اور زیادہ واضح الفاظ میں یہ فیصلہ کن محاربۂ عظیم تھا جمہوریت کے مغربی اور اسلامی نظریات اور فلسفہ ہائے زندگی کا۔ اس محاربۂ عظیم کا انجام یا تو مشرق میں اسلام اور اس کی عالم آرا اقدارِ حیات کی نشاۃ ثانیہ کا آئینہ دار بن سکتا تھا اور یا پھر بصورتِ دیگر (خاکم بدہن) ان عالمگیر تصورات کی صحت مند کارفرمائیوں سے اسلام نے اس برصغیر کے ماضی کو

اپنے بیش بہا لال و گہر سے مالا مال کر دیا تھا۔

اس مرحلہ پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے متعلقہ حالات و کوائف اور اس باب میں قائدِ اعظمؒ کی معرکہ آرائیوں کی تفصیل پیش کرنے کے بجائے ان تصورات کو منظرِ اشاعت پر لائیں جو تحریکِ پاکستان کا اصل الاصول ہیں اور نظریات و تصورات کے اس بنیادی اختلاف کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کریں جن کی بنا پر اس برِصغیر کی تقسیم ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر معرضِ وجود میں آئی۔ تحریکِ پاکستان کا منشاء و منتہیٰ کیا تھا؟ قائدِ اعظمؒ کن ارفع و اعلیٰ مقاصد کے لئے دو عظیم طاقتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہوئے تھے؟ ان عظیم قربانیوں کا پیش نہاد کیا تھا۔ جن کا مظاہرہ ان کٹھن منزلوں میں کرنا پڑا؟ یہ ہیں وہ اہم ترین مسائل جن کے حقیقی حل سے مملکتِ پاکستان کی تقدیرِ حیات وابستہ ہے اور جسے نظر انداز کر کے اس وقائے عہد کا امکان قطعاً پیدا نہیں ہو سکتا، جو اس مملکت کے معماروں کے لئے مقدس ترین فریضۂ حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ یہی وہ نقطۂ ماسکہ ہے جس کے محور پر پاکستان کی تقدیر گردش کرے گی اور یہی وہ نظریاتی اساس ہے جس سے ہمارے مستقبل کے ایوانوں کی تعمیر ہو گی۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کسی تحریک کے بنیادی مقاصد اور منتہیٰ کو جانچنے کے لئے عظیم ترین اور قابلِ وثوق شہادت اس کے قائد سالار کے اعلانات قرار پاتے ہیں۔ انہی سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ صورتِ حال کے وہ کونسے تقاضے تھے جن کی تکمیل کے لئے اس تحریک نے جنم لیا۔ وہ کونسی دعوتِ فکر و عمل تھی جو لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو ایک سلکِ تنظیم میں انسلاک اور ایک منزلِ مقصود پر جادہ پیمائی کی محرک ثابت ہوئی۔ پاکستان کے بہترین مفاد اور شاندار مستقبل کا تقاضا بھی قطعاً یہی ہے کہ ہم تحریکِ پاکستان کے ان تاریخی حقائق کو روشنی میں لائیں جو اس تحریک کے قائدِ جلیل کے قلب و نظر میں ابھرے اور پھر اس کے کاروانِ شوق کے لئے دعوتِ سفر قرار پا گئے۔ زیرِ نظر اشاعت میں ہمیں حیاتِ قائدِ اعظمؒ کے انہی حیات آفریں کوائف کی وضاحت مقصود ہے۔

ہمارے سامنے قائدِ اعظمؒ کی زندگی کی وہ تصویر آ چکی ہے جب ۱۹۳۰ء کے آغاز میں پہلی گول میز کانفرنس کے حسرتناک انجام نے ان کے عزم و استقلال کی ساری توانائیاں مضمحل کر کے رکھ دیں اور وہ لندن کے ایک گوشۂ تنہائی میں مایوسیوں سے نڈھال ہو کر وقفِ سکون ہو گئے۔ جس زعیم سیاست نے پوری زندگی میں مایوسیوں اور نامرادیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا قبول نہیں کیا تھا وہ ہیجان و اضطراب کی اتھاہ تاریکیوں میں امید کی ایک ایک کرن کے لئے ترس رہا تھا۔ اضطرابِ افکار کے اس ہجوم میں اس کے کانوں نے پہلی بار ایک دانائے راز اور حکیم الانقلاب کی قلندرانہ پکار کو سنا اور اس کے فکر و نظر کے تاریک گوشے ایک درخشندہ حقیقت کی تابانیوں سے جگمگا اٹھے۔ یہ اقبالؒ کی آواز تھی جو گنگ و جمن کے سنگم سے فضائے ہند میں مرتعش ہو رہی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (۱۹۳۰ء) کی مسند صدارت سے دینِ خداوندی کا یہ نقیب مخصوص حسین انداز سے ملت کی نشاۃِ ثانیہ کے سترِ عظیم کی نقاب کشائی کر رہا تھا۔ اور سچ پوچھئے تو یہی وہ خطبۂ صدارت تھا جو قائدِ اعظمؒ کے ملی سفر کے لئے بہت جلد نشانِ منزل

قرار پا گیا اور اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسلامیانِ ہند کی منزلِ مقصود متعین کر دی۔ جناحؒ نے اس آواز کو سنا جو بانگِ رحیل اور اذانِ سحر بن کر گونج رہی تھی۔ کچھ مدت تک اس نے کاروانِ ملت کے سفر کا نقشہ ترتیب دیا اور پھر وہ فاتحانہ جاہ و جلال کے ساتھ اپنے کاروان کو لئے ہوئے سرگرمِ سفر ہو گیا۔

اذانِ سحر

آیئے! اس مقام پر چند لمحے رک کر اس اذانِ سحر کی صدائے بازگشت کو فردوسِ گوش بنائیں جو حسبِ ذیل اعلان سے منزل کا سراغ دے رہی تھی — حکیم الامتؒ نے اپنے خطبہ میں فرمایا۔ "ہندوستان کی تاریخ میں جو نازک وقت مسلمانوں پر آج آچکا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اندر وحدتِ افکار و عمل پیدا کر کے مکمل طور پر منظم ہو جائیں۔ ان کی یہ تنظیم ملتِ اسلامیہ اور ہندوستان، دونوں کے حق میں، مفید ثابت ہوگی۔ ہندوستان کی غلامی ایشیا بھر کے لئے لاتعداد مصائب کا سرچشمہ بنی رہی ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اس ملک کو اظہارِ خودی کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے جس کے فیض سے یہ کبھی ایک عظیم الشان اور درخشندہ کلچر کی تخلیق کا موجب بنی تھی۔ جس سرزمین کے ساتھ ہماری زندگی اور موت وابستہ ہو چکی ہے اس کی طرف سے ہم پر ایک فریضہ عائد ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم پر ایشیا اور بالخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ مسلم ایشیا کے تمام ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلے کو صرف اسی زاویۂ نگاہ سے ہی نہیں دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں اسلام کا حشر کیا ہوگا۔ بلکہ اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت و حیات کا عالمِ اسلامی پر کیا اثر پڑے گا۔ ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے جو فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ہم ان سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جب تک ہمارا نصب العین متعین نہ ہو۔ اور اس کے حصول کے لئے ہم مستقل طور پر عزم نہ کر لیں۔ ہندوستان کے دیگر سیاسی گروہوں میں ہماری مستقل ملی ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم منظم، متحد اور ہم آہنگ ہوں۔ ہمارا بکھرا ہوا شیرازہ ان تمام سیاسی مسائل پر جن سے ہماری ملت کی زندگی اور موت وابستہ ہے بری طرح اثر انداز ہو چکا ہے۔ میں فرقہ وارانہ مسائل میں سمجھوتے کے بارے میں ناامید نہیں۔ لیکن مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔ ایسے خطرناک حالات میں آزاد راہِ عمل وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں جو حصولِ مقاصد کے لئے تلی بیٹھی ہوں۔"

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ مارچ ۱۹۳۸ء)

اور پھر انہوں نے منزل کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا۔

اگر آج آپ اپنے تمام تصورات اور تخیلات کو اسلام اور صرف اسلام کے نقطۂ ماسکہ پر مرکوز کر دیں اور اس زندہ و پایندہ اور قائم و دائم نظریۂ حیات سے، جو وہ پیش کرتا ہے نورِ بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشر قوتوں کو پھر سے مجتمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سرِ نو حاصل کر لیں گے اور یوں اپنے آپ کو

تباہی اور بربادی کے مہیب جہنم سے بچا لیں گے۔ (ایضاً)

اسی خطاب میں ان کے محبوب تصورات شدتِ آرزو کے ساتھ یوں لبوں تک آئے۔

میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اور ایک مسلمان کی حیثیت سے ان کی ان آرزوؤں کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر تھی کہ اسلام میں قومیت کی اساس وطن کے اشتراک پر قائم نہیں ہوتی بلکہ آئیڈیالوجی کے اشتراک پر۔ اور اس آئیڈیالوجی کا فطری تقاضا یہ ہے کہ اسے اپنے بنیادی اصول اور مستقل اقدار کو ایک زندہ نظام کی صورت میں متشکل کرنے کے لئے ایک خطۂ ارض کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اقبالؒ نے اسی خطبہ میں واضح کیا کہ:۔

اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔۔۔۔

۔۔۔۔اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو اس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ (ایضاً)

اسی جداگانہ مملکت کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔

یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انھیں بھی کہیں اپنی نشوونما ارتقاء کا موقع ملے۔ اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے ان کا مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں کا غلبہ اور تسلط ہو۔ (ایضاً)

ملّتِ اسلامیہ کی قیادت

یہ تھا وہ خطبۂ صدارت جس نے محمد علی جناحؒ کے افسردہ و پژمردہ افکار کو نئی امیدوں کی روشنی عطا کی۔ اور ۱۹۳۵ء میں جب وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ اور اس کے ہولناک نتائج سے اپنی ملت کو بچانے کے لئے لندن سے واپس پہنچے، تو انھوں نے آتے ہی آٹھ کروڑ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر منظم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

۱۹۳۷ء کے آغاز میں نئے انڈیا ایکٹ کے تحت کانگرس کو سات صوبوں کی وزارتوں پر مسلط ہونے کا موقع مل گیا اور نشۂ اقتدار کے اس نئے سرور میں کانگرسی کارفرماؤں نے ایسے ایسے گل کھلائے کہ اقبالؒ کے خطبۂ صدارت کے یہ الفاظ ایک محسوس حقیقت بن کر سامنے آ گئے کہ:۔

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں شاید ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۳ء)

اقتدار کے اسی نشے میں پنڈت ..... جواہر لال نہرو نے مارچ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا نیشنل کنونشن کے اجلاس میں بڑے طمطراق سے یہ کہا:۔

ایسے لوگ ابھی زندہ ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں، گویا دو قوموں اور ملتوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

یہ مرحلہ اسلامیانِ ہند کی تاریخ میں بڑا ہی نازک مرحلہ تھا۔ ان کی کیفیت ان بکھرے ہوئے موتیوں کی سی تھی جنھیں ایک سلک تنظیم میں پرونے کا کام ابھی بمشکل شروع ہوا تھا۔ لیکن قائداعظم جس عظیم پیش نہاد کے نقیب بن کر اُٹھے تھے اس کی روشنی میں انھوں نے پوری قوت سے اس چیلنج کا جواب دیا اور واضح کیا کہ مسلمان واقعی ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم کے افراد ہیں، اور یہ واضح کرتے ہوئے انھوں نے لکھنؤ کے خطبۂ صدارت میں (۱۹۳۷ء میں) اپنی ملت سے یہ دردمندی اپیل کی کہ:۔

مسلمان اگر اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو از سرِ نو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت صرف ایک ہی چیز انھیں یہ سہارا مہیا کر سکتی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اپنے کھوئے ہوئے یقین کو دوبارہ حاصل کریں اور اسی محکم اور بلند تصورِ حیات کا سہارا لے کر اٹھیں، جو ان کی عالمگیر قومی وحدت کا جزو لاینفک ہے اور جو انھیں ایک سیاسی وحدت میں منسلک کرنے کی ضمانت ثابت ہوگا۔

اور اس مرحلہ پر انھوں نے مسلمانوں کو کانگرس اور اس کے نیشنلزم کے فریب سے خبردار کرتے ہوئے یہ اعلان کیا:۔

مسلمانوں کے خلاف اغیار کے "فرقہ پرستی" اور "رجعت پسندی" کے طنزیہ نعرے سن کر آپ کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ دنیا کا بدترین رجعت پسند اور شریر ترین فرقہ پرست جب کانگرس کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال کر اپنی قوم کو گالیاں دیتا ہے تو وہی سب سے بڑا "نیشنلسٹ" قرار پاتا ہے۔ (مسئلہ دستور ہند۔ از نواب زادہ لیاقت علیخاں)

کانگرس اور اس کے عزائم کی نقاب کشائی

بھولے بھالے مسلمانوں کو تحریکِ پاکستان کے خلاف مبتلائے فریب کرنے کے لئے ایک منظم کوشش کے تحت پروپیگنڈہ کیا گیا (اور اب بھی یہ مہم جاری ہے) کہ ہندو مسلم کشمکش کی وجہ نزاع یہ تھی کہ کانگرس سارے ملک میں ایک مخلوط حکومت کی حامی تھی۔ اور مسلم لیگ کے "فرقہ پرست" انگریز کے اشارے پر، ملک کی تقسیم کے دعوی تھے۔ یہ غلط فہمی آج بھی ان حلقوں میں بدستور پائی جاتی ہے جو کانگرس کے منظم پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے اور بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہ کی۔ لیکن جب واقعات و حقائق کا بنظرِ غائر

جائزہ لیا جائے تو اصل معاملہ اس سے کہیں گہرا نظر آئے گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک اہم دستاویز ہمارے سامنے آتی ہے اور یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اس وقت کے جنرل سیکرٹری (آچاریہ کرپلانی) کا وہ طویل بیان ہے جس کے ذریعے انھوں نے اگست ۱۹۳۹ء میں "کانگریس کے مقاصد" کی نشان دہی کی تھی۔ اس بیان کا حسبِ ذیل اقتباس کانگریس کے عزائم کی منہ بولتی تصویر ہے۔ سنیئے اور غور فرمایئے.....!

> وہ لوگ جو کانگریس کے پروگرام کو تو مانتے ہیں، لیکن اس سیاسی عقیدہ کو ماننے سے انکار کرتے ہیں جس پر گاندھی جی نے کانگریس کے پروگرام کی بنیاد رکھی وہ درحقیقت نہ تو کانگریس کی حالیہ تاریخی ترقی سے واقف ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ گاندھی جی کے فلسفۂ حیات (آئیڈیالوجی) نے کانگریس میں کیا مرتبہ حاصل کر لیا تھا ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اب کانگریس صرف ایسی سیاسی جماعت نہیں جو ملک کو بدیشی اقتدار سے آزاد کرانا چاہتی ہے بلکہ یہ ہماری معاشرت کی موجودہ حیثیت کو بالکل بدل دینا چاہتی ہے اور اس کی بنیاد ایک قطعی طور پر نئے فلسفہ پر رکھنا چاہتی ہے۔ جب تک کانگریس پر گاندھی جی کا اثر غالب نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک کانگریس کے لیڈروں کا خیال تھا کہ ہماری سیاسی غلامی کو ہماری معاشرتی حالت سے براہِ راست کوئی بنیادی تعلق نہیں۔ اس لئے ان لیڈروں نے یہ طے کیا تھا کہ کانگریس کا یہ کام نہیں کہ وہ معاشرتی اصلاح کے کاموں میں دخل دے، وہ اسے بالکل سیاسی جماعت رکھنا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں یہ ممکن تھا کہ مختلف معاشرتی نظریئے رکھنے والے لوگ سیاسی حیثیت سے ایک محاذ پر جمع ہو جائیں۔ گویا ان لوگوں نے زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک سیاسی زندگی۔ دوسری معاشرتی زندگی۔ لیکن گاندھی جی نے آکر یہ اصول توڑ دیا۔ انھوں نے پرانے ڈاکٹروں کی تشخیص کو غلط قرار دے کر بتایا کہ ہماری سیاسی غلامی کوئی ایسی چیز نہیں جسے ہم اپنی اخلاقی، روحانی اور معاشرتی زندگی سے الگ کر سکیں۔ اس لئے ہماری سیاسی جدوجہد کو معاشرتی، اخلاقی اور روحانی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں۔ بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے تحت ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا

ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دَور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دَور ہے جسے گاندھی جی کانگرس کے ذریعے ہندوستان میں لانے کی سعی کر رہے ہیں۔ (طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۳۹ء)

گاندھی جی حقیقی روپ میں

اس اقتباس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ کانگرس کا نصب العین سیاسی آزادی کے حصول تک محدود نہ تھا بلکہ اب وہ اس مقصد و منتہیٰ کے لئے سرگرمِ کار تھی کہ اس برصغیر کی پوری آبادی پر گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کو ملک گیر نظام کی حیثیت سے مسلط کیا جائے۔ سوال پیدا ہوگا کہ گاندھی جی آخر کس فلسفۂ حیات کے معتقد اور داعی تھے۔ سو وہ بھی گاندھی جی کی اپنی زبانی سن لیجئے۔ انھوں نے اپنے متعلق فرمایا تھا کہ:

> میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں۔ کیونکہ میں ویدوں، اُپ نشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔۔۔۔ میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔ (ینگ انڈیا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

معرکۂ دین و وطن

یہ تھا وہ فلسفۂ حیات جو کانگرس کی جدوجہد کا اصل منشاء تھا۔ آیئے اب یہ دیکھیں کہ اس کے جواب میں مسلم لیگ اور قائدِ اعظمؒ کیا چاہتے تھے اور ان کے پیشِ نظر نصب العین کیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ کے خطبۂ صدارت (سالانہ اجلاس مدراس ۱۹۴۱ء) کا وہ اعلان سنیئے جس میں انھوں نے فرمایا کہ:

> مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انھیں کسی دوسری قومیت میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔

آئیڈیالوجی کی اساس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیتوں کا فرق اس قدر واضح تھا کہ وطن کے اشتراک پر ان کے ایک قوم کی صورت میں ڈھلنے کی کوئی صورت ہی ممکن نہیں تھی، چنانچہ ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے صاف اور واشگاف الفاظ میں واضح کر دیا۔

> ہندو اور مسلمان خواہ ایک گاؤں یا ایک شہر میں ہی کیوں نہ رہتے ہوں وہ کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ وہ ہمیشہ سے الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں۔

کراچی کے مسلم لیگ سیشن میں انھوں نے اس امر کی مزید وضاحت فرمائی کہ جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایک جداگانہ قوم ہیں اور ایک مخصوص فلسفۂ حیات رکھتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے۔ انھوں نے پہلے یہ

سوال کیا کہ:-

وہ کیا چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایک رشتے میں منسلک کر رکھا، وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی عمارتِ ملّی کی بنیاد ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے ان کی کشتی بندھی ہوئی ہے۔

اور پھر خود ہی اس کے جواب میں اس عظیم حقیقت کا اعلان کرتے ہیں۔

ان سوالوں کا جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ یہ محکم رشتہ، یہ سنگین چٹان، یہ آہنی لنگر، خدا کی وہ کتاب عظیم (قرآن) ہے جس نے تمام مسلمانوں کو جسدِ واحد بنا رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں وحدت زیادہ ہوتی جائے گی۔ اس لئے کہ ہمارا خدا ایک۔ خدا کی کتاب ایک۔ اس کا رسولؐ ایک۔ اس لئے ہماری ملّت بھی ایک ہے۔ (تقریریات و تحریراتِ جناحؒ)

بیورلی نکلس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (VERDICT ON INDIA) میں "ایک بطلِ عظیم سے مکالمہ" کے عنوان سے متعلقہ باب میں قائدِاعظمؒ سے اپنی (۱۹۴۳ء کی) ایک ملاقات کی تفصیل پیش کی ہے۔ اس ملاقات کے دوران میں وہ دیگر اہم سوالات کے ساتھ یہ سوال بھی کرتا ہے کہ:-

آپ کن وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دیتے ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک مذہبی اعتبار سے مسلمان ایک الگ قوم ہیں؟

اور پھر اسی شہرۂ آفاق صحافی اور انشاپرداز کی زبانی قائدِاعظمؒ کا جواب سنیئے —— جواباً انہوں نے فرمایا۔

یاد رکھیئے کہ اسلام صرف روحانی اور مذہبی اصولوں کا نام نہیں بلکہ ایک عملی نظامِ حیات ہے۔ میں زندگی پر ایک کل کی حیثیت سے غور کرتا ہوں اور پورے نظامِ حیات (مکمل دین) کے اعتبار سے مسلمانوں کو ایک مستقل اور جداگانہ قوم سمجھتا ہوں۔ زندگی کے ہر اہم شعبے اور ہر عنصر کے لحاظ سے، ہماری تاریخ کے لحاظ سے، ہمارے مشاہیر اور اکابر کے اعتبار سے، ہمارے آرٹ اور فنِ تعمیر کے لحاظ سے، ہمارے قوانین اور اصولِ قانون کے اعتبار سے، الغرض ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے مسلمان ہندوؤں سے الگ ایک ممتاز اور علیحدہ قوم ہیں —— (کسی قدر وقفہ کے بعد) —— ان تمام امور میں ہمارا زاویۂ نگاہ نہ صرف ہندوؤں سے مختلف ہے بلکہ اکثر شعبوں میں کلیتۃً متضاد ہے۔ ہمارا وجود اور ہماری دنیا ہی مختلف ہے۔ زندگی میں ہمیں ان سے مربوط کرنے والی کوئی چیز بھی تو دکھائی نہیں دیتی۔ ہمارے نام، ہماری غذا، ہمارا لباس، یہ سب ان سے مختلف ہیں۔ ہماری معاشی زندگی، ہمارے تعلیمی تصورات، ہمارے جنسی روابط —— حیوانات کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل، ہر نقطۂ پرکار پر ہم ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ (ورڈکٹ آن انڈیا)

تحریکِ پاکستان کا یہی وہ اساسی تصور تھا جس کے خلاف گاندھی جی نے بڑے غیظ و غضب کے عالم میں فرمایا تھا کہ :-

> میری روح اس تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریاتِ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کرنا میرے نزدیک خدا سے انکار کے مترادف ہے۔ کیونکہ میرا دلی عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۴-۳-۴۰)

گاندھی جی ایک قدم اور آگے بڑھے اور یہ لکھا کہ :-

> میں ایک تنگ نظر ہندومت اور تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور بہت بڑی قوم جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ تہذیبیں ایک دوسری میں جذب ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں جذب نہیں ہو سکتیں۔
> (ہندوستان ٹائمز ۱۵-۵-۴۰)

لیکن غیظ و غضب کا یہ طوفان قائدِ اعظمؒ کو مرعوب نہ کر سکا۔ وہ ان اثرات سے بہت بلند واقع ہوئے تھے ؎

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

قوم مذہب سے ہے

چنانچہ انھوں نے یکم جنوری ۱۹۴۱ء کو گاندھی جی کے نام ایک خط لکھا۔ یہ خط سیاسیات کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور اس قابل ہے کہ اس کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ اس خط میں گاندھی جی کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں لکھا :-

> آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے۔ لیکن کل تک جب آپ سے پوچھا جاتا تھا کہ زندگی میں آپ کا نصب العین کیا ہے؟ اور وہ کونسا جذبۂ محرکہ ہے جو انسان کو کسی مقصد کے لئے آمادۂ عمل کرتا ہے — کیا وہ سیاست ہے؟ — معاشرت ہے؟ یا مذہب؟ تو آپ کا جواب ہوتا تھا کہ وہ مذہب اور خالص مذہب ہے۔ کل تک تو آپ یہ کہتے تھے اور آج مجھ سے یہ فرما رہے ہیں کہ تم مذہب کو سیاست میں کیوں گھسیٹ لائے ہو۔ سُن لیجئے کہ میرے نزدیک زندگی کا کوئی شعبہ ہو مذہب انسان کے ہر عمل کو اخلاقی معیار عطا کرتا ہے۔ مذہب کو بیچ میں نہ لایا جائے تو انسان کی زندگی میں شورشغب کے سوا باقی کیا رہ جاتا ہے۔ (تقاریر و تحریرات جناح)

پاکستان۔ اسلامی آئیڈیالوجی کا مظہر

صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۸ جون ۱۹۴۵ء کے نام ایک پیغام میں قائدِ اعظمؒ نے

تحریکِ پاکستان کے مقاصد کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

یہ صرف جان توڑ، مسلسل اور ناقابلِ شکست مساعی کے زور پر ممکن ہو گا کہ ہم اپنے عوام میں ایسی قوت پیدا کر دیں جس سے نہ صرف آزادی و استقلال کا حصول ممکن ہو بلکہ اسے شایانِ شان طور پر متشکل بھی کیا جا سکے۔ پاکستان کا منتہا و مقصود آزادی اور استقلال تک محدود نہیں۔ یہ اس اسلامی آئیڈیالوجی کا آئینہ دار ہے جو ہمیں ایک بیش بہا ورثے اور سرمایۂ حیات کے طور پر حاصل ہوئی ہے اور جس کے ثمرات سے دیگر اقوام بھی مستفید ہوں گی۔ (تقاریر و تحریرات جناحؒ)

۲۷ جنوری کو ایڈورڈز کالج کے طلباء کے ایڈریس کے جواب میں انھوں نے کہا۔

ہم (ہندو اور مسلمان) دو عظیم اقوام ہیں جن کا اختلاف مذہب[۱] ہی کا اختلاف نہیں بلکہ ہم دو مختلف ثقافتوں کے حامل ہیں، ہمارا دین ہر شعبۂ حیات میں ایک ضابطۂ قانون عطا کرتا ہے اور ہم ان نظریات کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہندو لیڈرشپ ہم پر "رام راج" مسلط کرنے کا عزم رکھتی ہے اور مسلمانوں سے ایک اقلیت کا سا سلوک کر رہی ہے۔ (ایضاً)

سرحد مسلم لیگ کی صوبائی کانفرنس پشاور منعقدہ ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء میں ان کا خطاب بھی اسی نصب العین کا اعلان کر رہا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا۔

مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان ہے جہاں وہ اپنے مخصوص ضابطۂ حیات کے مطابق اپنی ثقافت و روایات کا نشوو ارتقاء اور اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں لا سکیں۔ (ایضاً صفحہ ۴۳۶)

قائدِ اعظمؒ کے یہ اعلانات پوری ملت کی اجتماعی امنگوں کے ترجمان تھے۔ یہ دس کروڑ مسلمانوں کے دلوں کی آواز تھی۔ چنانچہ اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس میں اپنی ۱۸ مارچ ۱۹۴۴ء کی تقریر میں کہا تھا۔

اسلام کے عہدِ ماضی کا احیاء

مسلم لیگ نے مسلمانوں کو ایک واضح نصب العین عطا کیا اور انھیں مایوسیوں اور تاریکیوں سے نکال کر ایک درخشندہ منزلِ مقصود تک لے آئی۔ وہ منزل جو ملت کا جزوِ ایمان قرار پا گئی، اور لاکھوں افراد اس کے لئے جانیں لڑانے پر تل گئے۔ اب پاکستان ایک نعرہ نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کے نزدیک ایک حقیقتِ ثابتہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ اسے اپنی سلامتی، نجات اور تقدیرِ ملی کا وہ مرکز و محور تصور کرتے ہیں جو دنیا کو بانگِ دہل بتا دے گا کہ ایک ایسی اسلامی مملکت معرضِ وجود میں آئی ہے جو اسلام کے عہدِ رفتہ کے کارناموں

---

[۱] مذہب سے قائدِ اعظم کا مفہوم آئندہ صفحات میں ان کے اپنے انٹرویو سے واضح ہو گا۔

کی یاد ایک بار پھر تازہ کر دے گی۔ (ایضاً ص۵)

بمبئی کے اسلامیہ کالج میں یکم فروری ۱۹۴۳ء کو تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ:-

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور اسی بنا پر ہم اپنی جداگانہ مملکت کا قیام عمل میں لائیں گے۔ (تقاریر و تحریرات جناح)

یہی واضح اور دو ٹوک اعلانات تھے جنہوں نے "رام راج" اور اکھنڈ ہندوستان کے مہاسبھائی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ گاندھی جی اور ان کے رفقائے سفر پورے برصغیر پر اپنا تسلط جمانے کے جو سہانے خواب دیکھ رہے تھے وہ خواب پریشان بنتے چلے گئے۔ پاکستان کا مقصود و منتہا پوری طرح نکھر کر ان کے سامنے آ چکا تھا۔ گاندھی جی دوسروں کو مبتلائے فریب کرنے کے لئے کبھی کبھی یہ بھی کہتے رہے کہ میں پاکستان کا مفہوم سمجھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے قائداعظمؒ سے اپنے سلسلۂ مراسلت میں بھی یہی مضحکہ خیز انداز اختیار کیا کہ انھیں پاکستان کا مفہوم سمجھا دیا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی تو ایک طرف ان کے شاگردوں تک یہ سب کچھ سمجھ چکے تھے۔ کیونکہ قائداعظمؒ نے اس نصب العین کو اس قدر صاف اور واشگاف الفاظ میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا کہ اس کے بعد اس قسم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں کانگرسی رہنما مسٹر منشی کی وہ صدارتی تقریر ہمارے سامنے آئی ہے جو انھوں نے یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ کی "اکھنڈ ہندوستان کانفرنس" میں ارشاد فرمائی تھی۔ اس خطبۂ صدارت میں انھوں نے ہندو مسلم اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے سامنے تحریکِ پاکستان کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:-

پاکستان ہندو کانگرس کی نگاہ میں

تمھیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے اماکن و مساکن (HOME LANDS) بنا لیں، جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکیں۔ اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

(ٹریبیون ۲/۱۱/۴۱)

اس کے بعد انھوں نے "اکھنڈ ہندوستان" کی وضاحت فرماتے ہوئے بتایا کہ:-

تم جانتے ہو کہ "اکھنڈ ہندوستان" کے سامنے کیا مقصد ہے؟ اس کا مقصد وہ عظیم الشان کلچر ہے جسے ہندی کلچر کہا جاتا ہے۔ وہ کلچر جو زمانہ قبل از تاریخ میں پیدا ہوا اور چھ ہزار

سال کی مدت مدید میں بڑھتا، پھولتا، پھلتا، زمانہ کی سطح کو روندتا اور مسلتا یوں آگے بڑھتا گیا جس طرح گنگا ماتا طوفان کے وقت اُمنڈتی چلی جا رہی ہو۔ (ایضاً)

ان تصریحات کے بعد انھوں نے قوم پرست مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ اہم سوال کیا تھا کہ:۔

میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ قوم پرست مسلمانوں نے مسلم عوام تک پہنچ کر انھیں (پاکستان کے) اس نظریۂ افتراق کے خطرات سے آگاہ کیوں نہیں کیا؟ (ایضاً)

اور زمانے کی نگاہوں نے تاریخ اسلام کا یہ جگر پاش منظر اس مرحلہ پر دیکھا کہ مسلمانوں کا ایک مقتدر مذہبی پیشوا (بقول مسٹر منشی) بے تابانہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ گھبرائیے نہیں۔ پاکستان کی مخالفت ہم کریں گے۔ یہ نظریہ اسلام کے خلاف ہے۔ (ہندوستان ٹائمز $\frac{11}{4}$ ۸)

یہ "مقتدر مذہبی پیشوا" کون تھے؟ یہ تھے لدھیانہ کے ایک مشہور مفتی اور جمیعتہ العلماء کانگرس کے رکن رکین۔ اقبالؒ نے شاید اسی صورت حال پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد　　کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آں جا　　پرستد مومن و کافر تراشد!

واضح رہے کہ کانگرسی رہنماؤں میں مسٹر منشی ہی واحد شہسوار نہیں جو تحریک پاکستان کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اترے۔ بلکہ پورا ہاسبھائی ذہن منظم طور پر حرکت میں آچکا تھا۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی مرکزی اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے قائد اور کانگرس کے انتہائی اعتدال پسند اور ذمہ دار قسم کے لیڈر تھے۔ لیکن تماشا دیکھئے کہ ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی اس جدوجہد کے خلاف وہ اس سے بھی بہت قبل مخالفت کے میدان میں آچکے تھے ان کے نومبر ۱۹۳۰ء کے ان الفاظ کو بھی سن لیجئے۔

بھولا بھائی ڈیسائی کا اعلان

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وہ وقت آچکا ہے کہ ہم اس کا اعتراف کرلیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمانوں کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انھیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لیا جائے اس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاسیات سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عہدِ حاضر میں بہترین نظام حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز $\frac{9}{8}$ ۳۰ء ۵)

مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کے بعد مسٹر ستیہ مورتی سامنے آتے ہیں۔ کانگرس کے مشہور پارلیمنٹیرین اور مرکزی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں جبکہ جنگ عالمگیر کے دوران میں مرکز میں کانگرس اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت قائم کرنے کی تجویز سامنے آئی تو انہی ستیہ مورتی صاحب

نے اعلان کیا کہ:۔

> کانگرس اس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کیونکر مخلوط حکومت بنا سکتی ہے۔ جس کا نصب العین اسلامی حکومت کا احیاء ہو۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۱ جون ۴۴)

معرکۂ دین و وطن

کانگرس کے چوٹی کے لیڈروں کا یہ پروپیگنڈہ برابر جاری رہا کہ قوم کا وجود وطن کے اشتراک پر قائم ہوتا ہے اس لئے اس برصغیر میں بسنے والے ایک وطن کی بنا پر ایک قوم ہیں۔ وہ قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے اس دعوے کے خلاف آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے کہ آئیڈیالوجی کی اساس پر بھی قوم کا وجود قائم ہوتا ہے۔ انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر اس دعوے کو تسلیم کر لیا گیا تو اکھنڈ ہندوستان اور رام راج کے قیام کی ساری کوششوں پر پانی پھر جائے گا۔ اور ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کی تشکیل ان کی مہاسبھائی امنگوں کو ہمیشہ کے لئے گہری قبر میں دفن کر دے گی۔ یہ تھی وہ جنگ جو ملک کی دو بڑی قوموں میں جاری تھی۔ یہ تھا وہ معرکۂ دین و وطن جس کے انجام سے ان قوموں کی زندگی اور موت کا سوال وابستہ تھا۔ قائداعظمؒ کا اپنے اس عظیم دعوے میں ادنیٰ سی لچک قبول کر لینا یا مسلمانوں کا اس محاذ سے پسپائی اختیار کر لینا یقیناً رام راج کی فتح کا حرفِ آغاز ہوتا اور نو کروڑ مسلمان اپنے ملی تشخص اور عدیم المثال روایات کے لحاظ سے ہمیشہ کے لئے اس برصغیر میں اپنی موت کے محضر نامہ پر دستخط کر دیتے۔ سب سے بڑی قیامت یہ تھی کہ قوم و وطن اور جمہوریت کے وہ تصورات جو قریب قریب ساری دنیا میں رائج ہو چکے تھے کانگرس کا ساتھ دے رہے تھے۔ دنیا کے ہر حصے میں مغرب کے انہی تصورات کی کارفرمائی تھی۔ اس لئے ملت کی نشاۃ ثانیہ کی یہ جنگ ایک چومکھی جنگ تھی۔ قائداعظمؒ بیک وقت دو محاذوں پر اپنی ملت کی قیادت کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ انھیں ہندوؤں کی منظم چیخ و پکار سے بھی نپٹنا پڑا اور ان مروّجہ مغربی تصورات سے بھی جو برطانوی حکمرانوں کی کتابِ سیاست کا مقدس باب قرار پا چکے تھے۔ لیکن تاریخ کا یہ کتنا بڑا معجزہ ہے کہ اس زعیم ملت نے ہر محاذ پر ڈٹ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ اس کے دلائل و براہین کی شمشیر جوہر دار نے ہر دو محاذوں پر دشمنوں کی صفوں میں کھلبلی سی مچا دی اور بالآخر سب کو شکست فاش دے کر اپنی فتح عظیم کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ دشمنوں کے طوفانِ ہاؤ ہو اور مخالفتوں کے اس ہجوم میں اس کے لرزہ فگن نعروں نے دلوں میں زلزلے ڈال دیئے۔ یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب مسلم فیڈریشن کے سالانہ اجلاس کے پلیٹ فارم سے انھوں نے عزم و یقین کی پوری قوت سے یہ اعلان کیا کہ:۔

> پاکستان ایک ایسی منزل ہے جس تک پہنچنے سے مسلمانوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ پاکستان کا تخیل ایک ایک مسلمان کے دل و دماغ پر چھا چکا ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ پاکستان، ہندوستان کی اسلامی مملکت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔۔۔۔۔۔
>
> ۔۔۔ اس برصغیر میں پاکستان کے سوا کوئی دوسرا دستور کامیاب نہیں ہو سکتا۔
>
> (خطبۂ صدارت پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن۔ یکم مارچ ۱۹۴۱ء)

اسی خطبۂ صدارت میں انھوں نے فرمایا کہ:۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہم ایک اقلیت نہیں۔ ہم ایک قوم ہیں اور ایک قوم کو ایک خطۂ ارض کی ضرورت ہوتی ہے۔ قومیں ہوا میں زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ ایک قوم کو خطۂ ارض پر زندہ رہنا ہے اُسے اس سرزمین پر اپنا نظامِ مملکت قائم کرنا ہے اور اس کی سرحدات کا تعین کرنا ہے۔ یہ ہے وہ مطالبہ جس کا حصول ہمارا منتہا و مقصود ہے۔ (ایضاً)

اس خطبۂ صدارت کے اختتام پر انھوں نے فرمایا:۔

یاد رکھیئے کہ جس مقصدِ عظیم کے لئے ہم برسرِ پیکار ہیں وہ محض مادی مفاد پر مبنی نہیں بلکہ یہ ملّتِ اسلامیہ کی روح کی پکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ اسے مسلمانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ قرار دیتا ہوں اور اسے سودے بازی کہنا سر بسر غلط ہے۔ مسلمان اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اگر ہم نے یہ بازی ہار دی تو ہم سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔ (ایضاً)

۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک ظہرانہ میں خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ:۔

قیامِ پاکستان کا آغاز تو اُسی وقت ہو گیا تھا جب ہندوستان کا پہلا ہندو اسلام لایا۔ ——اس سے بہت قبل جب یہاں مسلمانوں نے اپنی حکومت قائم کی۔ جونہی ایک ہندو اسلام کی آغوش میں آیا وہ نہ صرف مذہبی لحاظ سے بلکہ معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی طور پر اپنی سوسائٹی سے خارج کر دیا گیا۔ جہاں تک ایک مسلمان کا تعلق ہے اس پر تو اسلام کی طرف سے یہ فریضہ عائد ہے کہ وہ اپنے ملّی امتیاز اور تشخص کو کسی غیر اسلامی معاشرہ میں جذب نہ ہونے دے۔ چنانچہ ہر دور میں ہندو بدستور ہندو چلے آئے اور مسلمان مسلمان رہے اور انھوں نے کبھی اپنی اپنی خصوصیات کو ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہونے دیا۔ یہ ہے پاکستان کی اصل و اساس۔ (تقاریر و تحریرات جناحؒ)

قراردادِ پاکستان واحد حل ہے

اس صدارتی تقریر سے ایک سال قبل قائدِ اعظمؒ نے لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کی صدارت فرمائی تھی۔ یہی وہ قومی اجتماع تھا جس میں قراردادِ پاکستان کی صورت میں پہلی بار دس کروڑ مسلمانوں نے اپنی منزلِ مقصود کا تعین کیا۔ اس لحاظ سے اس اجلاس کی روئیداد ہماری سیاسیات میں ایک بے مثال تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور اس اجلاس میں قائدِ اعظمؒ نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا اس کا ایک ایک لفظ تحریکِ پاکستان کے نصب العین کی روشن تفسیر ہے۔ تحریکِ پاکستان کی بنیادی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ہم اس کا ایک اہم اقتباس پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ:۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت

کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں مذہب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں، ایک قوم کا غلط تصور حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے۔ اور ہماری بہت سی مشکلات اسی کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم نے بروقت اپنے رجحانات کی اصلاح نہ کی تو نتیجہ پورے ہندوستان کی تباہی ہوگا۔ یاد رکھئے کہ ہندو اور مسلمان مذہب کے معاملے میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے ـــ دونوں کا ادب جدا جدا ہے۔ نہ تو یہ آپس میں شادیاں رچا سکتے ہیں اور نہ ہی ایک دسترخوان پر کھانا کھا سکتے ہیں۔ حقیقتاً وہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر قائم ہیں۔ ان کی تاریخیں مختلف۔ ان کا رزمیہ جدا جدا اور مشاہیر الگ الگ۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ان کی فتح و شکست کی حیثیتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔

دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا، اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر ڈالے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا جائے گا۔ (قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح)

مہاتما جی کی خود فریبی

قائدِ اعظمؒ کے ان تمام اعلانات اور خطبات کو سامنے لائیے۔ ایک ایک لفظ محسوس و مشہود حقائق کی ترجمانی کر رہا ہے۔ ایک ایک دلیل جیتے جاگتے واقعات اور روشن مثالوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔ کہیں ابہام و اشکال نہیں۔ کہیں الفاظ کا الجھاؤ نہیں۔ نکھرے ہوئے مقاصد، صاف و شفاف آئینے میں جھلک رہے ہیں۔ لیکن بُرا ہو مہاسبھائی ذہن کی کرشمہ سازیوں کا کہ اس کے باوجود درخشندہ حقائق کو سیاسی عیاریوں سے غبار آلود کرنے کا رجحان برابر قائم رہا۔ اس رجحان کا اندازہ اس سلسلۂ مراسلت سے لگائیے جو بمبئی کی تاریخی گاندھی جناح ملاقات کے دوران میں وضاحت طلب امور کے متعلق دونوں عظیم رہنماؤں میں جاری رہی۔ اسی مراسلت میں سے قائدِ اعظمؒ کے نام گاندھی جی کا ۱۵ ستمبر ۴۴ء کا ایک مکتوب ہمارے سامنے ہے۔ اس خط میں گاندھی جی مسلمانوں کی جداگانہ قومی حیثیت کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> تاریخ میں مجھے کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اپنا مذہب تبدیل کرنے والی کسی جماعت یا اس کی اولاد نے اصل فرقے سے الگ قوم ہونے کا دعوے کیا ہو۔ اگر ہندوستان میں اسلام کے آنے سے پہلے ایک قوم بستی تھی تو ملک کے بہت سے باشندوں کے مذہب تبدیل کرنے کے باوجود اسے ایک ہی قوم رہنا چاہیئے۔۔۔۔۔ اگر سارا ہندوستان اسلام قبول کر لے تو کیا دو قومیں ایک ہو جائیں گی؟ (ایضاً)

غور فرمایئے اس مضحکہ خیز دلیل پر۔ اور پھر سوچئے کہ یہ ریت کے بند حقائق کے سیلاب کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے تو اور کیا ہوتا۔ کیا دنیا کا کوئی معقولیت پسند انسان قائدِ اعظمؒ کے لاجواب دلائل و براہین کے مقابلے میں خود فریبی کی ان ستم ظریفیوں کو کوئی اہمیت دے سکتا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے ان لیڈروں کو چیلنج کرتے ہوئے کس قدر درست کہا تھا کہ:۔

> آؤ اور اپنی نامعقول چیخ و پکار کا مقابلہ کرو اس حقیقت سے کہ اختلافِ مذہب کس طرح مطالبۂ پاکستان کی وجہ جواز قرار پاتا ہے۔

اور اس چیلنج سے قبل انہوں نے وہ حقیقت بدیں الفاظ پیش کی تھی کہ:۔

> پاکستان تو یہاں صدیوں سے موجود ہے۔ ہاں وہ اسی دن معرضِ وجود میں آگیا تھا۔ جب یہاں کا پہلا ہندو اسلام کی آغوش میں آیا۔ پھر وہ فوج در فوج اسلام میں آگئے اور ہندو مذہب اور اس کے فلسفہ نے انہیں ملیچھ اور اچھوت قرار دے دیا۔ ان سے اپنے مذہبی، معاشرتی، ثقافتی اور دیگر ہر قسم کے تعلقات ختم کر دیئے۔ اس کے بعد وہ ایک الگ سوسائٹی کے افراد قرار پا گئے اور بدستور اسی ملت سے وابستہ چلے آرہے ہیں۔ ہزار سال سے زیادہ مدت گذر گئی وہ آج تک ایک الگ سوسائٹی، ایک جداگانہ فلسفۂ حیات، جداگانہ مذہب اور سر بسر مختلف دنیا سے مربوط ہیں۔ (خطبۂ صدارت۔ سالانہ اجلاس پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن۔ یکم مارچ ۱۹۴۱ء)

پاکستان اور اسلامی حکومت کا اساسی تصوّر

تحریکِ پاکستان سے متعلق کانگرس اور مسلم لیگ کی آویزش کی جو تفاصیل ہم نے ان صفحات میں پیش کی ہیں وہ ان دلائل و براہین اور روشن حقائق پر مبنی ہیں جو مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ ایک ممتاز قوم قرار دیتے ہیں۔ اور اس سے مسلمانوں کی ایک جداگانہ مملکت کا مطالبہ اپنی وجہ جواز اختیار کرتا ہے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ مملکتِ پاکستان میں کس قسم کا نظام تحریکِ پاکستان کے قائدین کے پیشِ نظر تھا؟ یہ ہے وہ سوال جس کی اہمیت سالہا سال کے بعد بھی پاکستان میں بجنسہٖ محسوس کی جا رہی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وقت اور حالات کے تقاضوں نے آج اس کی اہمیت کو پہلے سے بھی کہیں بڑھا دیا ہے اور ہم بجا طور پر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر اس سوال کا جواب قائدِ اعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے منظرِ عام پر لایا جا سکے تو اس سے بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔ ذہنوں سے بہت سا گرد و غبار دھل جائیگا اور پاکستان کی مستقبل کی تعمیر کا وہ نقشہ نکھر کر سامنے آجائیگا جو دانائے اعظمؒ کا منتہاو مقصود تھا اور جس کو عملاً متشکل کرنے کے ولولوں میں پوری ملت ایک بنیانٌ مرصوص بن کر مخالفت کے پہاڑوں سے ٹکر لینے پر تل گئی تھی۔

اگرچہ جو کچھ ہم نے اس وقت تک پیش کیا ہے اس میں بھی پاکستان کی اسلامی مملکت کے متعلق واضح اشارے موجود ہیں۔ ہمارے سامنے اسلامی آئیڈیالوجی کو عملاً متشکل کرنے کا اعلان آچکا ہے۔ اسلام کے عہدِ رفتہ کے کارناموں کی بازآفرینی اور اس کے اصول و قوانین کی نشاۃِ ثانیہ کی حسین امنگیں واضح ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود مسئلہ کی نزاکت اس سے کہیں زیادہ ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس معاملہ میں قائدِ اعظمؒ کے

دو ٹوک اور قطعی اعلانات منظرِ اشاعت پر لائیں جائیں جو مطالبۂ پاکستان اور اس کے طرزِ حکومت کے بارے میں "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کے مصداق ہوں۔

آیئے! اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے قائدِ اعظمؒ کے اس اہم انٹرویو کو روشنی میں لائیں جو ۱۹ اگست ۱۹۴۱ء کو حیدرآباد دکن میں، عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء نے لیا اور جس کی تفصیل اور ٹیپ پریس کے ذریعے اخبارات میں شائع ہوئی۔ ہم سوالات اور ان کے جوابات کو بجنسہٖ پیش کرتے ہیں۔ غور سے سنیئے۔

سوال :۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب :۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے، البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریقِ کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال :۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب :۔ اشتراکیت۔ بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک۔ دراصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال :۔ ترکی حکومت تو سیکولر اسٹیٹ ہے۔ کیا اسلامی حکومت اس سے مختلف ہے؟

اس سوال کا پہلا حصہ تو ایک جداگانہ عنوان سے متعلق ہے۔ لیکن دوسرے حصہ میں جو کچھ قائدِ اعظمؒ نے کہا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پر بار بار غور کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ جواب ان تمام پیچیدگیوں کو صاف کر دیتا ہے۔ جو اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق عام طور پر ذہنوں میں پائی جاتی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:۔

جواب :۔ ترکی حکومت پر میرے خیال میں سیکولر اسٹیٹ کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصوّر کا امتیاز تو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی

بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

ان الفاظ پر پھر غور کیجئے کہ:

(۱) اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔

(۲) اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔

(۳) قرآن مجید کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔

(۴) اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

سوچئے کہ کیا اسلامی حکومت کے اصول و معانی کے متعلق اس سے زیادہ صاف، واضح اور جامع بات کچھ اور بھی کی جاسکتی ہے؟

سرِ خدا کہ عابد و زاہد بکس نہ گفت		در حیرتم کہ بادہ کشاں از کجا شنید

قرآنی نظام کی دعوت

اپنے دور کے ایک شہرۂ آفاق قانون دان کی حیثیت سے قائداعظمؒ فلسفۂ قانون اور اس کے اسرار و غوامض پر پورا عبور رکھتے تھے۔ انھیں بخوبی علم تھا کہ ایک دستورِ مملکت کس طرح اساسی قوانین کی بنا پر نشوونما حاصل کرتا اور ایک کامیاب نظام کی صورت میں برگ و بار لاتا ہے۔ اسی فکر و بصیرت کی روشنی میں انھوں نے دینِ خداوندی کی مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولوں کی اہمیت کو سمجھا اور اس یقینِ محکم کو اپنا خضرِ راہ بنایا کہ خدا کی آخری کتاب اسلامی مملکت کے اساسی قوانین کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ وہ کاروانِ ملت کو برابر یہ دعوت دیتے چلے گئے کہ اپنے نظامِ حیات کے ایوان کو قرآن کے انھیں غیر متبدل اصولوں پر قائم کرو۔ ستمبر ۱۹۴۵ء میں اپنے پیغامِ عید میں انھوں نے فرمایا:

> اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ "بحر اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ جس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے۔ جس کے قوانین نوعِ انسانی کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں۔ اور وہ قوانین، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے، مذہب[1]، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا۔ اخلاقیات کا معاملہ ہو یا جرائم کا۔ اس دنیا میں جزا ہو یا

حا۔ مذہب کے بارے میں قائداعظمؒ کا مفہوم سابقہ انٹرویو میں سامنے آچکا ہے۔

کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا۔ ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔ (تقاریر و تحریراتِ جناحؒ)

ایک عظیم انتباہ

یہ تھا قرآنی نظام کا وہ نقشہ جو پاکستان کی اسلامی سلطنت کے متعلق قائدِ اعظمؒ کے ذہن میں تھا۔ یہی نقشہ تھا جس میں کانگرسی لیڈروں کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا عکس نظر آ رہا تھا اور وہ اس مطالبہ کو ناکام بنانے کے لئے اپنے بے شمار اور منظم ذرائع و وسائل بروئے کار لا رہے تھے۔ اور اسی کے پیشِ نظر قائدِ اعظمؒ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کے یومِ پاکستان کی تقریب پر ملت کے نام اپنے پیغام میں اسے یوں خبردار کیا تھا۔

ہماری نجات، ہماری سلامتی اور عزت و آبرو کے تمام تقاضے پاکستان سے وابستہ ہیں۔ اگر ہم یہ جنگ ہار گئے تو ہم ختم ہو کر رہ جائیں گے اور اس برصغیر سے مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ (ایضاً صفحہ ۳۵۹)

مطالبۂ پاکستان کی یہی وہ اہمیت تھی جس کے پیشِ نظر وفاقی نظام کے نفاذ کی کوششوں پر قائدِ اعظمؒ نے برطانوی حکومت کو شدید انتباہ کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ:

غیر ملکی سنگینوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگرسی راج رچایا جا رہا ہوگا۔ ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اس کو مفلوج اور معطل بنا کر رکھ دیں گے۔ اسے تسلیم کرنا ہمارے لئے انتہائی اندوہناک اور سنگین نتائج کا موجب ہوگا، اور اس ظالمانہ اقدام سے اس برصغیر کے مسلمانوں کا مستقبل تیرہ و تار ہو جائے گا اور ان کی آزادی پر خطِ تنسیخ کھینچ جائے گا۔ (علی گڑھ سٹوڈنٹس یونین میں ۲ نومبر ۱۹۴۴ء کو تقریر)

یہ ہیں تحریکِ پاکستان کے قائد کے وہ اعلانات جو اس جنگ کے دوران میں مختلف مواقع پر دنیا کے سامنے آتے رہے اور ان کی بدولت تحریکِ پاکستان کا منتہا و مقصود پوری طرح نکھر کر سب کے سامنے آگیا۔ اس پوری جنگ کے دوران میں قدم قدم پر تحریکِ پاکستان کے مقاصد کا اسلام سے اس قدر گہرا رشتہ قائم رہا اور قائدِ اعظمؒ نے اپنے دو ٹوک اعلانات کے ذریعے اس وثوق سے اس گہری وابستگی کی ضمانت پیش کی کہ ملتِ اسلامیہ نے پورے یقین و اعتماد سے اس منزل کو اپنایا اور اس راہ کے تمام خطرات کا عزم و ہمت سے مقابلہ کیا۔ ہماری قومی زندگی کی یہی وہ درخشندہ حقیقت ہے جو مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں برابر چراغِ راہ اور نشانِ منزل کا کام دیتی چلی آ رہی ہے۔ اور یہی تھی آفتاب عالمتاب کی وہ کرن جس کے خلاف شپرہ و چشم عناصر کا شور و غوغا آسمانوں تک بلند ہوا۔ اسی آویزش کی داستان آئندہ اشاعتوں میں سامنے آئے گی۔

حیاتِ قائد کے سلسلۂ تفاصیل میں ہم اس وقت تک جو کچھ لکھ چکے ہیں اس سے قائدِ اعظمؒ کے وہ کارہائے نمایاں سامنے آ چکے ہیں جو انھوں نے ۱۹۳۰ء تک مسلسل پچیس ۲۵ برس برطانوی امپریلزم کے خلاف ملک کی

تحریکِ آزادی کے کارزار میں سرانجام دیئے۔ ازاں بعد ان کے تاریخی اعلانات و بیانات کی روشنی میں ملتِ اسلامیہ کی آرزوؤں اور امنگوں کا وہ منتہا و مقصود بھی منظرِ اشاعت پر آچکا ہے جو تحریکِ پاکستان کی شکل میں اس ملک کی تاریخ میں انقلابِ عظیم کا حرفِ آغاز ثابت ہوا۔ قومی زندگی کی ان حسین امنگوں نے چند ہی سالوں میں ہماری ملت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو ایک سیسہ پلائی دیوار کی صورت عطا کر دی۔ انہی آرزوؤں کے جذبِ دروں کی قوت سے ہم مشکلات و موانعات کے پہاڑوں کو زیر و زبر کرنے کے قابل ہو گئے۔ اسی لیلائے مقصود کی چشمکِ ناز نے ہمارے اجتماعی شعور کو حیاتِ تازہ کی تڑپ اور خلش سے مالا مال کیا۔ جذب و مستی کے یہی والہانہ عزائم ارضِ پاکستان کے حصول پر منتج ہوئے۔ نشاۃ ثانیہ کے یہی بے تاب ولولے تھے جنھوں نے آخر ایک دن ہمیں آزاد قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ یہ درست ہے کہ ہماری قومی زندگی کی یہ حسین ترین امنگیں ابھی بہ تمام و کمال حاصلِ مراد کو نہیں پہنچیں۔ لاریب کہ ارضِ پاک میں ابھی قرآنی نظام کی وہ بساط نہیں بچھی جس کی خوشگواریاں جنتِ ارضی کا سماں باندھتی ہیں۔ بے شک ابھی اس صبحِ بہار نے یہاں، اپنے چہرے سے نقاب نہیں اٹھا جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ملت سالہا سال سے وقفِ انتظار چلی آرہی ہے۔ یہ سب کچھ بجا اور درست۔ لیکن ساتھ ہی اس حقیقت کو نہ بھولئے کہ ان حسرتوں اور ارمانوں کا تعلق اب قائدِ اعظمؒ کی ذاتِ گرامی سے نہیں بلکہ یہ سب کچھ ملت کی ذمہ داریوں اور فرض شناسیوں سے وابستہ ہے۔ اور ہم یہاں ملت کی ذمہ داریوں کا تذکرہ نہیں چھیڑ رہے بلکہ ملت کے قائدِ اعظمؒ کی سیاسی تگ و تاز کی داستانِ جمیل بیان کر رہے ہیں، اس لئے اب ہمیں اس وضاحت سے آگے بڑھ کر براہِ راست اس مقام پر آجانا چاہیئے جہاں سے اس انقلاب انگیز اور محشر خیز تگ و تاز نے تحریکِ استخلاصِ ہند سے تحریکِ استقلالِ پاکستان کا رخ اختیار کیا۔ ہمارا یہ موضوع قائدِ اعظمؒ کی زندگی کے اس دور کی تفصیل پیش کرتا ہے جب وہ ۱۹۳۵ء میں انگلستان سے ایک نئے پیش نہاد کا عزم لے کر واپس لوٹے اور ان کی سیاسی جدّ و جہد کا ہر گوشہ تنظیم ملت کے تقاضوں پر مرکوز ہو گیا اور مارچ ۱۹۴۰ء تک جبکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور سیشن میں قراردادِ پاکستان پہلی بار دنیا کے سامنے آئی۔ وہ اپنے کاروانِ ملت کو برابر ایک زندہ قوم کی صلاحیتوں سے بہرہ ور کرتے چلے گئے۔

زندگی کا عبوری دور

قائدِ اعظمؒ ایسے عظیم اور مسلمہ سیاست دان کا جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۰ء تک مسلسل اور پیہم پورے ہندوستان کی آزادی کے لئے صفِ اوّل میں سرگرم پیکار رہا اور پچیس سال کی اس طویل مدت میں ہندو مسلم اتحاد کے کم و بیش تمام تاریخی اجتماعات میں اس کی اہمیت شمعِ محفل کی طرح واضح رہی۔ تحریکِ پاکستان کی نئی اور قطعی طور پر مختلف منزل کا رُخ اختیار کرنا متحدہ ہندوستان کی تاریخِ سیاسیات کا ایک اہم واقعہ ہے۔ لیکن اس واقعہ کا پس منظر شہادت دے گا کہ اس قدر عظیم قائد کی زندگی کا یہ اہم ترین موڑ نہ تو بچوں کا سا کوئی کھیل تھا اور نہ ہی جذباتی ترنگ کی کوئی ہنگامی روش۔ ہندو کانگریس کا مہاسبھائی ذہن ملکی آزادی کی جان توڑ کوششوں کو "گنگا کے دہانے میں" جس طرح ڈبوئے چلا جا رہا تھا اٹل حقائق اور تلخ تجربات کی روشنی میں اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا، جو

قائدِاعظمؒ کی سیاسی زندگی کے اس انقلاب کی صورت میں سامنے آیا اور حالات نے ثابت کر دیا کہ قائدِاعظمؒ کا یہ نیا موڈ پوری ملت کی اجتماعی جدوجہد کا موڈ قرار پا گیا۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک قائدِاعظمؒ کی عمل برانداز زندگی ملکی سیاسیات سے دامن کش نظر آتی ہے۔ یہ دور ان کی زندگی کا "عبوری دور" ہے۔ صفِ اوّل کے اس عظیم قافلہ سالار کو ہم اس مدت میں ہر میدان سے غائب پاتے ہیں اور اگر اس کا کہیں سراغ ملتا ہے تو لنڈن کے ایک پُرسکون گوشے میں جہاں مایوسیوں کی تاریکیوں میں وہ اس روشنی کا متلاشی ہے جو زندگی کی حقیقی منزل کی نشاندہی کر سکے۔ ہم قائدِاعظمؒ کی اپنی زبانی ان کی اس کیفیت کا نقشہ پیش کر چکے ہیں اور ضمناً یہ بھی بتا چکے ہیں کہ روشنی کی یہ کرن بالآخر جلوہ بار ہوئی، اور انھوں نے اس منزل کو پا لیا جو دس کروڑ مسلمانوں کے عروج و اقبال، ان کی آزادی و استقلال اور نشاۃِ ثانیہ کی امین ثابت ہوئی اور اس نے نہ صرف "ہندو راج" کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا، بلکہ اس برصغیر کی پوری تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔

۱۹۳۰ء میں وہ مایوسی اور شکست کے اس مقام پر کھڑے تھے جہاں نہ کوئی منزل سامنے تھی، اور نہ نشانِ منزل۔ ان کی زندگی سربسر ایک طلسمِ پیچ و تاب بن رہی تھی کہ ایک جہاں تاب روشنی نے نئی منزل کو ان کی نگاہوں کے سامنے واشگاف کر دیا۔

مراجعت فرمائے وطن

اس مقام پر فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قائدِاعظم مایوس ہو کر لنڈن بیٹھ گئے تھے اور انھوں نے سیاسیات سے قطع تعلق کر لیا تھا، تو وہ کونسی کشش تھی جو انھیں پھر سے اس وادیٔ پُرخار میں کھینچ لائی۔ وہ کونسی شخصیت تھی جس نے انہیں اپنے فیصلہ پر نظرثانی کرنے پر آمادہ کر لیا۔ جن حضرات کے سامنے قائدِاعظمؒ کی سیرت آچکی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ کس قدر پختہ ارادہ کے انسان تھے ـــــ اس قدر پختہ ارادہ کے کہ سطحی لوگ انہیں "ضدی" کہہ دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے انسان کو اپنا فیصلہ بدلنے پر آمادہ کر لینے کے لئے کسی عظیم شخصیت کی ضرورت تھی اور ایسی طاقتور مقناطیسی کشش کی حاجت جو انہیں کشاں کشاں ان کے عزلت کدہ سے باہر نکال لائے۔ وہ شخصیت تھی علامہ اقبالؒ کی، اور وہ کشش تھی زندگی کے ایک مقصد اور جدید نصب العین کی جو انہیں کھینچ کر واپس لے آئی۔ قائدِاعظمؒ کے سوانح حیات کا مرتب، ہکٹر بولیتھو لکھتا ہے کہ "اپنے تمام پاکستان کے دوران، مسٹر جناح نے اقبال سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ نہایت اچھے دوست تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جناح نے اقبال کے دلائل کو فوراً تسلیم نہ کیا" لیکن بالآخر وہ مان گئے۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ کا وہ خط بڑا اہم ہے جو انھوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو قائدِاعظمؒ کو لکھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا۔

> میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں گذرتا ہوگا۔ (میرے اس اسرار اور تکرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں

آنے والا ہے۔ اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔ (ص ۱۱۵)

یوں "ہندو مسلم اتحاد" کی کوششوں سے مایوس ہو کر انگلستان جانے والے "نیشنلسٹ" جناح، ملتِ اسلامیہ کی کشتی کے کھیون ہار بن کر مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ تاکہ تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیں۔

انگلستان سے واپس پہنچتے ہی وہ خطرے کا بگل بجا دیتے ہیں۔ اس دعوت کو لبیک کہتے ہوئے مسلمان ابھی قومی تنظیم کے ابتدائی مرحلے طے کر رہے تھے کہ اواخر ۱۹۳۶ء میں صوبائی انتخابات کا کٹھن مرحلہ سامنے آگیا۔ نتیجۃً کانگرس سات ہندو اکثریت کے صوبوں پر مسلط ہو گئی۔ اور ۱۹۳۷ء کا آغاز ان صوبوں کے مسلمانوں کے ہیجان و اضطراب کے طوفان لئے نمودار ہوا۔

تحریکِ پاکستان کا پس منظر

۱۹۳۷ء سے اسلامیانِ ہند کی قومی بیداری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یہی تھا سیاسیاتِ ہند کا وہ نازک مرحلہ جہاں سے قائدِ اعظمؒ کی جولانیاں ایک انقلابِ نو کا علم لئے آگے بڑھتی ہیں۔ کل کا "پیامبرِ اتحاد" اب صرف اپنی ملت کا قائدِ اعظمؒ بن کر ملت کے سفینۂ حیات کی ناخدائی کے لئے میدان میں نمودار ہوتا ہے۔ بیک وقت دو محاذ اس کے سامنے آگئے ہیں۔ ایک طرف برٹش امپیریلزم کی پُر جلال قوت اور دوسری جانب وہ منظم اور برسرِ اقتدار کانگرس جس کی پشت پر ٹاٹا اور برلا کے خزانے تھے۔ وہ دونوں قوتوں کے چیلنج کو مردانہ وار قبول کرتا ہے اور چومکھی جنگ لڑتا ہوا دونوں کے بالمقابل دیوانہ وار ڈٹ جاتا ہے ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

قائدِ اعظمؒ اپنی ملت کی پاسبانی کے لئے آگے بڑھتے ہیں ——— یہ ملت مدت سے ریت کے ذروں کی طرح پریشان تند و تیز جھونکوں کی زد میں چلی آرہی تھی۔ لیکن اب وہ از سرِ نو ایک پیکرِ کوہ کی صورت میں ڈھلنے کے لئے بے تاب تھی۔ اس نازک مرحلے پر انہیں محمد علی جناحؒ جیسے قائدِ جلیل کی قیادت نصیب ہوئی۔ اور یہ حقیقت نکھر کر منظرِ عام پر آگئی اور وہ پوری کامیابی سے دشمنوں کے حملوں کو پسپا کرتے اور اس کی سیاسی مہم بازیوں کو مات دیتے ملت کو لے کر بحفاظت تمام فتح و ظفر کی منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔

اشاعتِ زیرِ نظر میں ہم اس سیاسی آویزش کے سلسلۂ دراز میں سے قائدِ اعظمؒ کے مارچ ۱۹۴۰ء تک کے کارناموں کی داستان پیش کر رہے ہیں۔ کیونکہ مارچ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان ایک واضح نشانِ منزل بن کر سامنے آگئی تھی، اور اس مقام سے ایک نئے باب کا آغاز ہوا تھا۔ یہ اہم باب آئندہ اشاعت میں "تحریکِ پاکستان" کے عنوان سے سامنے لایا جائے گا۔ مارچ ۱۹۴۰ء تک کے واقعات پر مشتمل زیرِ نظر اشاعت تنظیمِ ملت کے ابتدائی دور کا نقشہ بھی پیش کرے گی اور تحریکِ پاکستان کا پس منظر بھی۔

سات صوبوں کی وزارتوں پر اپنا تسلط قائم کرتے ہی کانگرس نشۂ پندار کی بدمستی میں کھو گئی، اور اس کے ناقوس خصوصی پنڈت جواہر لال نہرو نے اسی نشے میں اعلان کیا کہ ہندوستان میں دو ہی طاقتیں ہیں

انگریز اور کانگریس۔۔۔۔ پنڈت جی کا یہ اعلان واضح طور پر مسلم لیگ اور مسلمانوں کی اُبھرتی ہوئی قوت تنظیم کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ قائداعظمؒ جیسا بے باک اور عظیم مدبّر اس چیلنج کو خاموشی سے گوارا کر لیتا۔ کانگریس کے لامحدود وسائل۔ بے پناہ قوتِ تنظیم اور بالخصوص سات صوبوں کی۔۔۔۔۔ وزارتوں پر اس کا قبضہ۔ ان سب کے مقابلے میں قائداعظمؒ اور اس کے کاروانِ شوق کی بے سروسامانی۔ لیکن ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

ملّتِ اسلامیہ کی عزت کا امین مردانہ وار آگے بڑھا اور ملک کی سیاسی فضا میں اس کی یہ لرزہ فگن گرج سنائی دی۔

یہاں ایک تیسری طاقت بھی موجود ہے اور وہ ہے نو کروڑ مسلمانوں کی طاقت۔
اسے نہ انگریز نظر انداز کر سکتا ہے اور نہ کانگریس۔

اور اس کے تھوڑی ہی مدت بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ (۱۹۳۷ء) میں واقعی دنیا نے اس تیسری طاقت کو جاہ و جلال کے محسوس و مشہود پیکروں میں جلوہ نما دیکھ لیا۔ لکھنؤ کا یہ بے مثال قومی اجتماع سیاسیاتِ ہند میں ایک نئی صبح کا عنوان تھا۔ پنجاب۔ بنگال اور آسام کے وزرائے اعظم اس قومی دربار میں مسلم لیگ سے عہدِ وفا استوار کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ اور یہ واضح ہو گیا کہ اسلامی ہند کی وہ تمام قوتیں جو صدیوں سے زوال اور شکست سے دوچار چلی آ رہی تھیں۔ اب ایک بے مثال اجتماعی شعور سے مالا مال ہو کر حیاتِ تازہ کی باز آفرینیوں کے لئے پَر تول رہی ہیں۔

مجاہدانہ للکار

ملّتِ اسلامیہ کا یہی وہ تاریخی اجتماع تھا جس میں ملّتِ اسلامیہ نے پہلی بار انگریز اور کانگریس کے مقابلہ میں اپنے قومی تحفظ کے بلند بانگ ارادوں کا اعلان کیا۔ اس اجلاس میں قائدِ اعظم کا خطبۂ صدارت تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ چنانچہ ان کی مجاہدانہ للکار بانگِ رحیل بن کر گونجی اور کانگرسی وزارتوں کے گھناؤنے کردار سے نقاب اٹھتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا کہ:۔

کانگریس نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لئے ہے۔ اس نے نام نہاد نیشنلزم کا سوانگ بھر رکھا ہے۔ اور میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کانگریس پارٹی کی موجودہ پالیسی جماعتی عناد اور فرقہ وارانہ مناقشت پیدا کر کے ملوکانہ تسلط کے استقرار کا باعث ہوگی۔

(خطبۂ صدارت۔ اجلاس لکھنؤ۔ از قائدِ اعظمؒ)

اور اس کے بعد ملّت کے سامنے اس کی منزل کی نشان دہی کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

مسلمان اگر اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو از سرِ نو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت صرف ایک ہی چیز انہیں یہ سہارا مہیا کر سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے کھوئے ہوئے یقین کو

دوبارہ حاصل کریں اور اسی محکم اور بلند تصور کا سہارا لے کر اٹھیں جو اُن کی عالمگیر قومی وحدت کا جزوِ لاینفک ہے اور جوان کو ایک سیاسی وحدت میں منسلک کرنے کا باعث ثابت ہوگا۔ مسلمانوں کے خلاف اخبار کی فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کے فسنزیہ نعرے سُن کر آپ کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ دنیا کا بدترین رجعت پسند اور شریرترین فرقہ پرست جب کانگرس کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال کر اپنی قوم کو گالیاں دیتا ہے تو اگلے روز وہی سب سے بڑا نیشنلسٹ قرار پا جاتا ہے۔ (ایضاً)

فروری ۱۹۳۸ء میں انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

کانگرس نے ہمارے نوجوانوں کے دل و دماغ کو زہر آلود کرنے کی کوشش کی ہے اور انہیں ایسے سبز باغ دکھائے ہیں کہ وہ یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ کانگرس واقعی آزادیٔ کامل کی علمبردار ہے۔ لیکن درحقیقت کانگرس کا مقصد کیا ہے؟ اصل کانگرس حکومتِ برطانیہ سے بعض عہد و پیمان حاصل کرنا چاہتے تھے اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو اب وہ اسی دستور سے نہ صرف مستفید ہو رہے ہیں بلکہ اس پر پوری طرح عمل پیرا ہیں۔ جسے تباہ کرنے کا بڑے زور و شور سے دعویٰ کیا تھا۔

انھوں نے اس خطاب میں مزید یہ واضح کیا کہ:۔

مسلم لیگ نے بڑی حد تک مسلمانوں کو برطانوی سامراج کے پنجہ سے نجات دلا دی ہے۔ لیکن اب ایک نئی طاقت سامنے آئی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ حکومتِ برطانیہ کی جانشین ہے۔ آپ اسے جس نام سے چاہیں پکار لیں۔ لیکن وہ اصل میں صرف ہندو اور ہندو راج ہے۔

اب ملکی سیاسیات ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھیں۔ کانگرس صوبائی اقتدار کے نشے میں مہاسبھائی ذہن کی کرشمہ سازیوں کو بروئے کار لا رہی تھی اور دوسری طرف ان مظالم نے اسلامیانِ ہند کے سیاسی شعور اور احساسِ خودی کو ابھارا اور وہ فوج در فوج مسلم لیگ کے پرچم تلے منظم ہونا شروع ہو گئے۔ کانگرسی اقتدار ملت کے لئے خطرے کا بگل ثابت ہوا۔ ع

تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشمِ ملت کھل گئی

دوسری عالمگیر جنگ

عین اس وقت جبکہ ملکی سیاسیات میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمگیر جنگ کے شعلے یک بیک بھڑک اُٹھے۔ برطانوی سامراج کے سامنے موت و حیات کی کشمکش کا ایک کڑا اور نازک ترین مرحلہ نمودار ہوا۔ اور اس نے ضروری سمجھا کہ اس خطرناک آزمائش میں ملک کے ممتاز رہنماؤں سے مذاکرات کا سلسلہ قائم کر سکے ہندوستان کی رائے عامہ کو ہمنوا بنایا جائے۔

گاندھی جی کے ساتھ وائسرائے بہادر نے قائدِ اعظمؒ کو بھی ملاقات کی دعوت دی۔ اس مذاکرہ سے

بعد قائدِ اعظمؒ نے مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس طلب کیا اور ۱۷-۱۸ ستمبر کے اجلاس میں جو اہم قرارداد منظور کی اس میں یہ واضح کیا گیا کہ:-

نشانِ منزل

۴- مجلسِ عاملہ اس بات کو واضح کرنا چاہتی ہے کہ مسلمانانِ ہند ہندوستان کی سیاست میں ایک خاص اور نرالی حیثیت رکھتے ہیں اور بیسیوں برس سے وہ اس جدوجہد میں مصروف ہیں کہ ملک کی قومی زندگی حکومت اور انتظامی امور میں ان کو عزت اور وقار کا مقام حاصل ہو۔ تاکہ مسلمان اپنے سیاسی، اقتصادی کلچرل اور جماعتی حقوق و مفاد کے تحفظ کی ضمانت کے ساتھ اکثریت کے دوش بدوش مساوی طور پر سرگرمِ عمل ہوں۔

قرارداد کے چھٹے نکتہ میں کہا گیا۔

تمام اسلامی ہندوستان، ہندوستان کی مرکزی حکومت کے خلاف صف آرا ہے اور بار بار اس نے آزاد ہندوستان کی تائید میں اعلان کیا ہے مگر وہ اتنا ہی مخالف اس کا ہے کہ مسلمانوں یا دیگر اقلیتوں پر ہندوؤں کا استبداد قائم ہو اور اسلامی ہند کو غلام بنایا جائے۔

قرارداد کے آخر میں کہا گیا:-

اگر حکومتِ برطانیہ اس نازک، عالمگیر اور شدید خطرہ میں مسلمانانِ ہند کا پورا، مؤثر اور باعزت اشتراکِ عمل چاہتی ہے اور اس کی یہ خواہش ہے کہ یہ کامیابی سے ختم ہو تو اسے چاہیئے کہ مسلمانانِ ہند میں سلامتی اور اطمینان کا احساس پیدا کرے اور آل انڈیا مسلم لیگ کا اعتماد حاصل کرے۔ کیونکہ اسلامیانِ ہند کی نمائندگی کی مجاز یہی انجمن ہے۔
مجلسِ عاملہ مسلمانوں سے اپیل کرتی ہے کہ اس مشکل اور نازک وقت میں اس عزمِ راسخ کے ساتھ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع رہیں کہ نو کروڑ مسلمانوں کی عزت، وقار اور مستقبل کے لئے جس قربانی کی ضرورت ہو اس سے دریغ نہیں کریں گے۔

(مسئلہ دستورِ ہند۔ از نوابزادہ لیاقت علی خاں)

۲۸ ستمبر کو قائدِ اعظمؒ نے عثمانیہ یونیورسٹی کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ ڈنر میں شرکت فرمائی اور اس یادگار موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

میں ہمیشہ سے اس کا قائل ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان معاہدہ طے ہو۔ لیکن یہ معاہدہ قابلِ احترام ہونا چاہیئے۔ ایسا نہیں جس کا مقصد یہ ہو کہ ایک تباہ ہو جائے اور دوسرا جئے اور پروان چڑھے۔ ہماری بدنصیبی ہے کانگرس کا اقتدارِ اعلیٰ اس کے لئے تیار نہیں کہ دوستی کے ہاتھ کو تھامے۔ بلکہ وہ اس ہاتھ کو مٹانے کے درپے ہے جو دوستی کے لئے بڑھایا جائے۔ اس وقت کسی کو روشنی نظر نہیں آ رہی۔

میں ہر مسلمان سے کہوں گا کہ اسلام آپ میں سے ہر ایک سے، اور مجموعی طور پر سب سے یہ توقع رکھتا ہے کہ اپنا فریضہ سرانجام دیں اور اپنی ملت کی حمایت میں اس طرح بنیانٌ مرصوص بن کر کھڑے ہو جائیں گویا سب ایک نفس ہیں۔
(مسئلہ دستور ہند)

بانگِ رحیل علی گڑھ یونیورسٹی یونین کی فرمائش پر انہوں نے مسلم نوجوانوں کے نام ایک پیغام میں مزید فرمایا:۔

مسلم لیگ ہندوستان کی کامل آزادی کی طالب ہے۔ ایسی آزادی جو کسی ایک فرقہ کے لئے نہیں بلکہ ان سب قوموں کے لیے ہو جو اس برصغیر میں آباد ہیں۔ مسلم لیگ ایک داعی ہے ایک آزاد اور خودمختار اسلام کی۔ اور اسلام ہر مسلمان سے توقع کرتا ہے کہ اس کے لئے اپنا فرض ادا کرے۔ تاریخ کے اس نازک دور میں وہ مقام اور منصب حاصل کرنے کے لئے جو مسلمانوں کی روایات اور ماضی کے ورثہ کے شایانِ شان ہو۔ جس قدر بھی عظیم قربانیاں کی جائیں کم ہیں اور بالخصوص اس وقت جبکہ ایک ہولناک جنگ اور خطرناک ترین صورتِ حال درپیش ہے، جس سے یقیناً نظامِ عالم بدل جائے گا، مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے مسلم نوجوان جن پر قومی ذمہ داریوں کا بار پڑنے والا ہے نو کروڑ اسلامیانِ ہند کے مستقبل کی تعمیر میں مدد کرنے سے قاصر نہیں رہیں گے۔ (ایضاً)

مسلم لیگ اب قائدِاعظمؒ کی قیادت میں نو کروڑ مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم کا منصب حاصل کر چکی تھی — وائسرائے کے سرکاری مذاکرات میں قائدِاعظمؒ کو صدر کانگرس اور گاندھی جی کے برابر مقام حاصل ہو چکا تھا۔ اور ان کی مضبوط قیادت میں مسلمانوں کے خلاف کانگرس کے تمام منصوبے خاک میں مل رہے تھے۔ اس صورتِ حال نے کانگرسی رہنماؤں کو آپے سے باہر کر دیا۔ گاندھی جی جیسا ذمہ دار اور آزمودہ کار رہنما تلملا اٹھا اور "ہری جن" میں ایک مقالہ سپردِ قلم کرتے ہوئے انھوں نے قائدِاعظمؒ پر الزام لگایا کہ:۔

کذب و افترا مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جناح صاحبؒ کی اُمیدیں دولتِ برطانیہ سے وابستہ ہیں۔ کوئی چیز جو کانگرس کرے اور دے انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔

۵ نومبر ۱۹۳۹ء کے اخبارات میں قائدِاعظمؒ نے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے ایک بیان میں کہا۔

یہ قطعی افترا اور اسلامیانِ ہند کی توہین ہے جس کا مسٹر گاندھی جیسے مرتبے کے شخص کو مرتکب نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

جوابِ آں غزل اور پھر انہوں نے واضح فرمایا:۔

میں مسٹر گاندھی کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند اپنی اور صرف اپنی

طاقت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے حقوق و مفادات کے لئے کانگرس اور برطانیہ دونوں کے علی الرغم آخری خندق تک جنگ لڑنے کا عزم کر لیا ہے، اور کسی دوسرے پر تکیہ نہیں کرنا چاہیئے۔ (مسئلہ دستورِ ہند)

اپنے آئینے میں خود فریبی کا یہ کیسا عجیب و غریب مرحلہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ پر برطانیہ پرستی کا..... الزام عائد کرنے سے صرف ایک ہفتہ قبل گاندھی جی برطانوی سامراج کے حق میں یہ عجیب و غریب اعلان فرما چکے تھے۔

تھوڑی دیر کے لئے غور کیجئے کہ اگر انگریز اچانک ملک کو خالی کر دیں تو کیا ظہور پذیر ہوگا؟ اگر ملک میں حکومت کرنے کے لئے کوئی بیرونی حکومت موجود نہ ہو تو اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ پنجابی خواہ وہ مسلمان ہوں یا سکھ، ہندوستان کو اپنی جولاں گاہ بنا لیں گے ..... ہم نے ملک میں جمہوریت کا جو ڈھونگ رچا رکھا ہے تو وہ صرف انگریز کی سنگینوں کی امداد پر منحصر ہے۔ پس اگر کسی کو یہ ضرورت ہے کہ کسی طاقتور عنصر کی دست برد سے ملک کو بچانے کے لئے انگریز یہاں موجود رہیں تو وہ کانگرسی ہندو اور وہ دیگر لوگ ہیں جن کی نمائندگی کا کانگرس کو دعویٰ ہے۔ (اسٹیٹس مین ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء)

ایک اہم انتباہ ایک طرف گاندھی جی کو انگریزوں کے اچانک چلے جانے کا غم یوں ستا رہا تھا اور دوسری طرف مسٹر جناحؒ انگلستان کے شہرۂ آفاق روزنامہ لندن ٹائمز کے ایک مقالہ کا جواب دیتے ہوئے برطانیہ پر واضح کر رہے تھے۔

میں بلا خوفِ تردید یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلم لیگ، ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی اس سے زیادہ صحیح معنوں میں اور مؤثر طریق پر کر رہی ہے جس طرح کہ ملک معظم کی موجودہ حکومت برطانوی قوم کی کر رہی ہے۔ اگر اخبار "ٹائمز" کا یہ خیال ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے سائے میں مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ ان کے سر منڈھا جا سکتا ہے تو وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ مسلمان قطعاً اس کے لئے تیار نہیں کہ اپنی تقدیر اور مستقبل کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ یہ آخری فیصلہ خود مسلمان ہی کر سکتے ہیں کہ کیا کچھ ان کے لئے بہتر ہے۔ بنا بریں وہ تمام عناصر جو ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل میں حصہ دار ہیں۔ ان سب پر لازم ہے کہ مسلمانوں کو ایک معزز اور ذمہ دار قوم متصور کریں۔ (مسئلہ دستورِ ہند)

جنوری ۱۹۴۲ء کے وسط میں قائدِ اعظمؒ نے راجکوٹ سے ایک اہم بیان حوالۂ اشاعت کیا۔ اس بیان میں وہ حکومتِ برطانیہ کو بھی مخاطب کرتے ہیں۔ قوم کی تنظیمی قوت بھی کتنی اہم شے ہے اور اس پر ان کا پُر جلال اندازِ تخاطب۔ انہوں نے فرمایا۔

میں انتباہ کئے دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وائسرائے اور حکومتِ برطانیہ پورے طور

پر اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ اگر ماضی کی صورتِ حال کا اعادہ کیا گیا یا ان ضمانتوں کو پورا نہ کیا گیا جو دی جاچکی ہیں یا ان کا احترام ملحوظ نہ رکھا گیا تو ہندوستان میں نہایت ہی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ مسلم ہندوستان ان تمام ذرائع سے جو اس کے اختیار میں ہیں ایسی صورتِ حال کا مقابلہ کرے گا اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔ (ایضاً)

اعترافِ حقیقت قائدِ اعظمؒ کی یہی جرأت رندانہ تھی اور آزادی کے حصول کے یہی ولولے تھے جن سے ہر آزادی پسند شخصیت شدید طور پر متاثر ہوئی۔ چنانچہ نومبر ۱۹۳۹ء کے آغاز میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے ان سے شرف ملاقات حاصل کیا تو ملاقات کے بعد اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کانگرس کے اس ممتاز رہنما نے برملا کہا۔

ہماری باتیں بالکل کھل کھلی ہوئیں اگرچہ ہمارے زاویۂ نگاہ میں فرق ہے لیکن جہاں تک مطمحِ نظر کا تعلق ہے لیگ اور کانگرس میں کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں کا نصب العین آزادی ہے۔ (اسٹیٹس مین ۶ نومبر ۱۹۳۹ء)

یومِ نجات ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو اسلامیانِ ہند نے قائدِ اعظمؒ کی اپیل پر "یومِ نجات" منایا۔ یومِ نجات کے ملک گیر منظم اور عدیم المثال مظاہرے اس قوتِ تنظیم کے بے مثال مظہر تھے جو قائدِ اعظمؒ کی قیادت میں صدیوں کے بعد پہلی بار اس برصغیر کے مسلمانوں میں پیدا ہوئی۔ "یومِ نجات" کا پس منظر یہ تھا کہ مسلم لیگ کے مسلسل مطالبہ کے پیشِ نظر حکومتِ برطانیہ نے فیڈرل سکیم کو جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا جزو لاینفک تھا معطل کر دیا۔ وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے اس سلسلہ میں پہلے ۱۱ ستمبر ۱۹۳۹ء کو مرکزی اسمبلی میں ملک معظم کا پیغام پڑھ کر سنایا اور پھر ۱۷ ستمبر کو ایک وضاحتی بیان میں بتایا کہ:-

ملک معظم کی گورنمنٹ نے مجھے یہ اعلان کرنے کا اختیار دیا ہے کہ اختتامِ جنگ پر وہ خوشی سے مختلف فرقوں، پارٹیوں اور مفادات کے نمائندوں اور والیانِ ریاست سے مشورہ کریں گے تاکہ اس قسم کی ترمیمات کرنے میں جو مناسب معلوم ہوں ان کی مدد اور تعاون حاصل کیا جائے۔

مسلم لیگ کے اس مطالبے کے جواب میں کہ ملک کی آئینی ترقی کے بارے میں اس سے مشورہ اور منظوری حاصل کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ مذکورہ سرکاری اعلان میں کہا گیا۔

یہ ناقابلِ تصور ہے کہ ہم ہندوستان کے آئندہ دستورِ حکومت کے کسی اہم جزو کو از سرِ نو وضع کرنے بیٹھیں یا اس میں کسی اعتبار سے ترمیم کریں اور یہ بغیر ان سے (مسلمانوں سے) مشورہ کئے ہو۔

فیڈرل اسکیم کے اس طرح معرضِ التواء میں پڑ جانے سے کانگرس کے ہندو راج کے منصوبے خاک میں مل گئے۔

۔۔۔۔۔۔اس نے برطانیہ کو جنگِ عظیم کے خطروں میں گھرا دیکھ کر کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے قیام کا مطالبہ کر دیا اور اس سلسلے میں حکومت کو مرعوب کرنے کے لئے ۲۲ اکتوبر کو سات صوبوں کی کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ کانگرسی رہنما اس خود فریبی اور خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ دورانِ جنگ میں ان کا یہ اقدام انگریز کو ان کے مطالبہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دے گا اور دنیا کی رائے عامہ بھی ان کی تائید کرے گی۔ یہ تھی وہ راہ جس پر چل کر کانگرس کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی اور اس طرح پورے ملک پر اپنے استبداد کا سکہ بٹھانا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے اس حقیقت کو محسوس نہ کیا کہ اب ایک نئی قوت پورے نظم و ضبط کے ساتھ اُبھر کر اس کے مقابلے میں آچکی ہے اور اُسے وہ قیادت حاصل ہے جو ۹ کروڑ مسلمانوں پر استبداد کے سارے منصوبوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گی۔ کانگرس نے بساطِ سیاست پر ابھی اس مہرے کو بمشکل حرکت دی تھی کہ قائداعظمؒ اپنے مخصوص فاتحانہ جلال سے مقابلے میں آگئے اور انہوں نے اسلامیانِ ہند کے نام یہ اپیل شائع کر دی کہ کانگرس کے ہمہ سیمائی استبداد اور غلبہ و استیلاء سے نجات حاصل کرنے کی خوشی میں "یومِ نجات" منایا جائے۔ قائداعظمؒ کی اس اپیل پر ملک کے طول و عرض سے صدائے لبیک بلند ہوئی۔ دیگر اقلیتیں بھی ان مظاہروں میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑی تھیں اور ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ملک کے طول و عرض میں "یومِ نجات" اس ولولے اور منظم جوش و خروش سے منایا گیا کہ مسلم لیگ کی ہمہ گیر قوتِ تنظیم اور قائداعظمؒ کی عدیم النظیر فراست کی دھاک برطانیہ اور کانگرس دونوں پر بیٹھ گئی اور کانگرس اپنے ان مظالم کی بنا پر جو اس نے نشۂ اقتدار میں اقلیتوں پر ڈھائے تھے اپنی فتح کے ڈنکے بجانے کے بجائے عدل و انصاف کی بارگاہ میں مجرم بن کر کھڑی تھی۔ "یومِ نجات" کو روکنے کے لئے کانگرس نے تمام حربے استعمال کئے۔ گاندھی جی نے اپیل شائع کی اور پنڈت جواہر لال نے قائداعظمؒ سے ملاقات کے لئے سلسلہ مراسلت قائم کیا اور اس اپیل اور مراسلت میں بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر اس اقدام کے روکنے کی خواہش کی، لیکن اس ضربِ کلیمی کو روکنا کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی اکثریت کے جنون میں کانگرس نے اقلیتوں کے خلاف ظلم کی جس دودھاری تلوار کو استعمال کیا تھا اور ان کی قومی اُمنگوں کو پامال کرنے میں جو دیدہ دلیری دکھائی تھی اس کی صدائے بازگشت سے فضاؤں میں لرزہ طاری ہو گیا۔

با حدیثِ دیگراں

مشہور صحافی مسٹر آرتھر مور اپنے ایک مقالہ میں جو "ہماری جنگ" کے عنوان سے اسٹیٹس مین میں شائع ہوا قائداعظمؒ کی عظیم فراست کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا۔

> ایسے نازک وقت میں ایسا محکم اور اتنا جلد فیصلہ مسٹر جناح کے جوہرِ قیادت کی ایک ایسی دلیل ہے جس کا مقابلہ اگر کیا جا سکتا ہے تو مسٹر چرچل کی اس تقریر سے جو انہوں نے جرمنی کے روس پر حملہ آور ہونے کے وقت کی تھی۔ (اسٹیٹس مین۔ ۲۳ نومبر ۱۹۴۱ء)

دستور ساز اسمبلی کا مطالبہ

انہی ایام میں وزارتوں سے مستعفی ہونے کے بعد کانگرس کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے سوال کو مختلف طریقوں سے ابھار کر منظرِ عام پر لا رہی تھی۔

گاندھی جی اس سلسلے میں "ہریجن" میں دھڑا دھڑ مضامین شائع کر رہے تھے اور ان میں مسلم لیگ کے خلاف الزام بازیوں کی مہم بھی شروع کر رکھی تھی۔ یکایک وہ ایک قدم آگے بڑھے اور برطانوی رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لئے "نیوز کرانیکل" میں ایک مضمون شائع کرا دیا۔ یہ مضمون کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے مطالبہ کی وضاحت اور حمایت میں تھا۔ قائداعظمؒ دیر سے ہریجن میں شائع شدہ الزام بازیوں کا خاموشی سے مطالعہ کر رہے تھے۔ لیکن جوں ہی نیوز کرانیکل میں گاندھی جی کا مضمون شائع ہوا وہ دلائل سے مسلح ہو کر میدان میں آ گئے اور ایک ہی ٹھوکر سے پروپیگنڈے کے اس گھروندے کو پاش پاش کر دیا جو نیوز کرانیکل کے ذریعے گاندھی جی نے تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اخبارات کے نام اپنے بیان میں انہوں نے صاف اور واشگاف الفاظ میں اعلان کیا۔

> مسٹر گاندھی جیسے شخص کا اس سے زیادہ فتنہ پردازانہ بیان اور نہیں ہو سکتا۔ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ وہی گاندھی ہیں جو راستبازی کے مبلغ بنتے ہیں۔
>
> اب جبکہ کانگرس کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے یعنی یہ کہ وہ ہندوستان کی نمائندہ نہیں مسٹر گاندھی نے یہ پسند فرمایا ہے کہ وہ کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے مؤید بن جائیں۔ جو ہندوستانی کے موجودہ حالات میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ کانگرس کی جماعتی نوعیت کا دوسرا اور زیادہ ضخیم ایڈیشن ہے...........
>
> وہ (مسٹر گاندھی) برطانیہ کے دوست کی حیثیت سے جس کے ساتھ ان کے بہت ہی گہرے ذاتی تعلقات ہیں اس کے لئے اضطراب ظاہر فرماتے ہیں کہ وہ فتح یاب ہو اور وہ بھی اس لئے نہیں کہ وہ آلاتِ حرب کے استعمال میں افضل ہے بلکہ اس لئے کہ اس کا یہ ارادہ ہے کہ انتہا تک "حق" پر قائم رہے۔ لہٰذا وہ اس کے لئے مضطرب ہیں کہ برطانیہ اپنی فتح مندی کے لئے ان کا اتباع کرے۔

حقیقت پسندی کی دعوت

انہوں نے بڑی تفصیل سے گاندھی جی کے اس بیان کا تجزیہ کیا، اور ان کے دلائل کے تضاد کو واضح کرتے ہوئے آخر میں فرمایا:-

> میری تمنا ہے کہ مسٹر گاندھی اس قسم کی رائیں شائع کرنا بند کر دیں جو ہر لحظ اور ہر ہفتہ بدلتی رہتی ہیں اور اپنے دماغ کو اس مسئلہ کے حل پر لگائیں جو اہمیت کے لحاظ سے ایک ہی ہے۔ یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے تصفیہ کا مسئلہ۔ کانگرس کے لیڈروں میں وہی ایسے شخص ہیں جو ہندوؤں کی ہندوؤں کی حیثیت سے نمائندگی کر سکتے ہیں۔ اور ہندوؤں کی طرف سے مختارانہ حل کے ذریعے ملک کی سب سے بڑی دو قوموں میں "سمجھوتہ کرا سکتے ہیں۔ پھر جو ہونے والا ہے ہوتا رہے گا۔ مجھے اس پیش کش کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ باعزت سمجھوتہ کے لئے

میں مسلمانوں کی طرف سے ہر وہ امداد دینے کو تیار ہوں جو میرے اختیار میں ہے۔
(مسئلہ دستورِ ہند)

سیاسی امراض اور اُن کا علاج

قائداعظمؒ مزید آگے بڑھے اور انہوں نے "نیوز کرانیکل" میں گاندھی جی کے شائع کردہ مذکورہ مضمون کے جواب میں ۱۹ رجنوری ۱۹۴۰ء کو انگلستان کے اخبار "ٹائمز اینڈ ٹائڈ" میں ایک اہم مضمون حوالۂ اشاعت کیا۔ اس مضمون کا عنوان تھا ــــــ "ہندوستان کے سیاسی امراض اور اُن کا علاج" ــــــ اس مضمون میں انہوں نے اپنی مخصوص قوتِ استدلال سے ان "دستوری عوارض" کی وضاحت کی جو اس برصغیر کے جسدِ سیاسی کو لاحق تھے اور بالتفصیل بتایا کہ جمہوریت کے مروّجہ تصور کو جو مغربی ذہن کی پیداوار ہے اس ملک پر مسلط کرنا جہاں ایک سے زیادہ اقوام آباد ہیں ناقابلِ برداشت تصور کیا جائے گا۔ انہوں نے دستوری اصلاحات سے متعلق جوائنٹ سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کا حسبِ ذیل اقتباس اوّل شہادت کے طور پر پیش کیا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی جداگانہ حیثیتوں پر یوں تبصرہ کیا گیا تھا:۔

> ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہ سخت تر مفہوم کے اعتبار سے مذہب ہی کا فرق نہیں بلکہ نظامِ حیات اور ثقافت کا بھی تفاوت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں ممیّز اور جداگانہ تہذیبوں کے نمائندے ہیں۔ ہندومت ذات پات کے اس مظاہرے سے متعارف ہوتا ہے جو اس کے مذہبی اور معاشرتی نظام کی بنیاد ہے۔ دوسری طرف اسلام ہے جو انسانی مساوات کے اصول پر مبنی ہے۔ (مسئلہ دستورِ ہند)

اس شہادت کے ساتھ ہر دو اقوام کے مابین مبینہ امتیاز کو واضح کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے بتایا کہ ایسی صورت میں مغربی جمہوریت کے اصولوں پر کسی دستور کی تشکیل و تنفیذ یہاں ہندو اکثریت کے غلبے اور استبداد کا پیش خیمہ ثابت ہوگی اور پھر انہوں نے کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے قیام کے سلسلے میں گاندھی جی کی بے تابیوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے برطانوی عوام کو بتایا۔

> مسٹر گاندھی جو صفِ اوّل کے ایک ہوشیار ہندو سیاست دان ہیں کی قیادت میں کانگریس نے (جو بالخصوص ایک ہندو جماعت ہے) بہت دنوں پہلے پیش بینی کر لی تھی کہ مغربی جمہوریت کے اندر ہندوؤں کے لئے تمام ہندوستان پر مستقل غلبہ حاصل کرنے کی امیدوں کی تکمیل کا سامان پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ان کی تمام کوششیں اور قوتیں اس پر مرکوز ہو گئیں کہ ہندوستان کے لئے ایک جمہوری طرز کی حکومت حاصل کی جائے انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر نئے دستور کو ان اصولوں پر چلایا جا سکے جو ان کے لیڈر اور ورکنگ کمیٹی نے ترتیب دیئے تھے تو نیا دستور انہیں ..... منزلِ مقصود کے انتہائی قریب پہنچا دے گا۔ (ایضاً) (باقی باقی) ــــــ